اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

نومبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۲۱ء/ ربیع الاوّل ۱۴۴۳ھ

مدیر: ڈاکٹر محمد امین — نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

مشمولات

○ فکرو نظر

ظالمانہ بے حسی	مدیر	۴

○ تعلیم و تربیت

۔ عہد نبوی کے اصولِ تعلیم و تربیت	مفتی ڈاکٹر محمد کریم خان	۶
۔ اسلامی معاشرے میں جامعات کا کردار	پروفیسر ملک محمد حسین	۱۱
۔ جدید اسلامی ریاست میں پرائمری کا نصاب	ڈاکٹر محمد امین	۲۲

○ تزکیۂ نفس

تاتاریوں میں اشاعت اسلام تزکیہ و تصوف کا کردار	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ	۲۴

○ افغانستان

۔ جنگ ابھی جاری ہے	ڈاکٹر محمد امین	۲۹
۔ طالبان حکومت سے ناجائز مطالبے		۳۰
۔ طالبان کا نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیے؟		۳۲
۔ اسلامی معاشرے میں خواتین کا کردار طالبان اور اسلام کا معاشرتی نظام		۳۸
* طالبان کا معاشی نظام	ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری	
۔ طالبان حکومت قحط سالی کا مقابلہ کیسے کرے؟		۴۴
۔ نام نہاد 'اسلامی بینکاری' سے طالبان کو شدید خطرہ		۴۸
۔ طالبان مغرب کے نظامِ سرمایہ داری سے کیسے بچیں؟		۵۲
* طالبان کا سیاسی نظام		
۔ طالبان کو جمہوری عمل رد کر دینا چاہیے		۵۷

○ تفہیم دین

۔ تلاوتِ دین یا اقامتِ دین؟	مدیر	۶۱
۔ کیا ہم پاکستانی واقعی غریب ہیں؟	پروفیسر ایم اے رفرف	۶۷

○ تفہیم مغرب

مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (تیسری قسط) مسلمانوں پر اس کا رڈ واجب اور اس کی پیروی حرام ہے	مدیر	۶۹

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
پروفیسر ملک محمد حسین
حافظ عمران رضا طحاوی

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے
سالانہ 800 روپے۔ پانچ سال: 4000 روپے
تاحیات 15,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے زیرانتظام

تدریس القرآن پراجیکٹ

فری کتابیں اور فری ٹیچرز ٹریننگ

* سکولوں میں آسان انداز میں ترجمۂ قرآن سکھانے کا پروگرام
* پانچویں جماعت سے اوپر کی جماعتوں کے لیے
* اساتذہ کی گائیڈ اور طلبہ کی کتاب بلا ترجمہ الگ
* دو رنگوں میں نفیس طباعت
* لاہور کے سکولوں میں تنفیذ کی خصوصی مہم جاری ہے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

0300-4107282   300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب۔خدشات و مضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
اسلامی علوم میں تحقیق: اصول، ترجیحات اور معیار	۳۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرطبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ہینڈ بک وگائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنی	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ وتجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیرموثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب۔ ناگزیر ہے	۳۵۰
عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرطبع)	

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِ مغرب	۳۰۰

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

فکرونظر

ظالمانہ بے حسی

افغانستان کے لاکھوں مسلمان بھوک سے مرنے کو ہیں لیکن پاکستانی عوام، مخیر حضرات، دینی جماعتوں، فلاحی تنظیموں، حکومت پاکستان، اوآئی سی، مسلم ممالک سب نے بے حسی کی چادر اوڑھ رکھی ہے

زبانی جمع خرچ کے علاوہ عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانی حکومت نہ تو طالبان کی افغان حکومت کو تسلیم کرنے کو تیار ہے اور نہ علی الاعلان ان کی غذائی اور مالی مدد کرنے کو تیار ہے حالانکہ وہاں قحط کی سی صورتِ حال ہے جسے مغرب اپنی زبانی میں 'انسان المیہ' کہتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ امریکہ اور یورپ یہ نہیں چاہتے! یعنی طالبان سے شکست خوردہ امریکیوں اور یورپیوں کا آج بھی اتنا رعب اور اتنی دہشت ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور مسلم حکومتیں ان کے آگے دم نہیں مار سکتیں۔

چین اور روس اگر امریکہ و یورپ کی مرضی کے خلاف طالبان حکومت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ الکفر ملة واحدة اور پھر ان کے اپنے بھی مفادات ہیں کہ یہ دونوں ملک اپنے ہاں کروڑوں کی مسلمان اقلیت کو کچل کر اور دبا کر رکھے ہوئے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کے مقبوضہ مسلمان علاقوں کو افغانستان کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ملے.... ہمیں گلہ تو مسلم ممالک سے ہے۔ پاکستان، ایران، ترکی اور دوسرے مسلم ممالک کیوں افغان حکومت کو تسلیم نہیں کرتے؟ کیوں ان کی غذائی اور مالی امداد نہیں کرتے؟ انفراسٹرکچر اور ترقی تو بعد کی بات ہے ابھی تو وہاں لوگوں کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور بھوک منہ کھولے کھڑی ہے۔

چلیں پاکستانی حکومت و اسٹیبلشمنٹ کے کچھ مفادات ہوں گے کہ وہ امریکہ و یورپ کو ناراض نہیں کر سکتی، وہ پاکستان میں طالبان کی حمایت کی لہر کو بلند ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتی کہ اس کے لیے انہیں نفاذ اسلام کی طرف جانا پڑے گا جو انہیں گوارا نہیں، ہمیں افسوس تو پاکستان کی دینی قوتوں پر ہے۔ علماء اور دینی جماعتیں کیوں خاموش ہیں؟ مخیر حضرات کیوں چپ ہیں؟ فلاحی

تنظیمیں کیوں خاموش ہیں؟ افغانستان میں قحط جیسی صورتِ حال ہے لیکن یہ حضرات انہیں غذائی امداد بھجوانے کے لیے بھی متحرک ہونے کو تیار نہیں؟ کیا وہ اس حد تک حکومت پاکستان کی پالیسیوں کے آگے بے بس ہیں کہ بھوکے افغانیوں کو آٹے کے چند سو ٹرک بھی نہیں بھجوا سکتے؟ مثلاً ’الخدمت‘ سمندر پار غزہ کے فلسطینیوں کی امداد کے لیے پہنچ سکتی ہے لیکن ساتھ بیٹھے افغانیوں کی مدد کے لیے متحرک ہونے کو تیار نہیں! پھر پاکستان میں اسلامی انقلاب اور نظام مصطفیٰ بلکہ ربیع الاوّل میں عشق مصطفیٰ کے نعرے لگانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ اور ان کی کیا حقیقت ہے؟

ربیع الاوّل کا پیغام

اے بادِ صبا! کملی والےؐ سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمّت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دُور وصالِ بحر ابھی، تُو دریا میں گھبرا بھی گئی!

عزّت ہے محبّت کی قائم اے قیس! حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزّت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لَیلا بھی گئی

کی ترک تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی مِلی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبالؔ سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

اقبال

تعلیم و تربیت

مفتی ڈاکٹر محمد کریم خان[۱]

عہد نبوی کے اصولِ تعلیم و تربیت

آپ ﷺ نے تعلیم کو مسلمان کا فریضہ اور انسان کا اولین حق قرار دیا

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے لیے جن اداروں کو منظم کیا اور ان کے ذریعے اجتماعی زندگی کے تسلسل کو قائم رکھا ان میں تعلیم کا ادارہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تعلیم دراصل ایک نسل کے تجربات کو دوسری نسل میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ معلومات بہم پہنچانے کے سادہ سے عمل نے ایک انتہائی پیچیدہ اور وسیع نظام کو بنیاد فراہم کی ہے۔ کسی معاشرے کے اجتماعی شعور اور انفرادی تشخص کے ارتقاء کا دارومدار زیادہ تر تعلیمی اداروں پر ہے جو ماحول تعلیمی درس گاہوں کا ہوگا وہی ماحول کسی نہ کسی طرح پورا معاشرہ اپنائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے تعلیمی نظام اور تعلیمی درس گاہوں کی عظمت پر بہت زور دیتی ہے۔ قومی زندگی میں نظام تعلیم کی وہی حیثیت ہے جو فرد کے لیے اس کے دماغ کی ہوتی ہے۔ نظام تعلیم ہی نسلوں کو کسی بلند نصب العین کی پرواز کرنے کے لیے فکر و حکمت کے بال و پر دیتا ہے۔ اس لیے تعلیم اور نظام تعلیم پر توجہ دینا عوام اور حکومتوں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔

مسلم حکمرانوں کی علمی روایت

مسلمان اس لحاظ سے خوش بخت رہے کہ ان کے حکمرانوں نے تعلیم کو ہمیشہ اولیت دی، مسلمانوں میں شاندار علمی روایات کی حامل حکومتیں عہد نبوی ﷺ، خلافت راشدہ، بنو امیہ، بنو عباس، اندلس، ہندوستان اور خلافت عثمانیہ رہی ہیں۔ ان تمام حکمرانوں کی تعلیمی پالیسی کے بنیادی خدو خال وہی ہیں جو ہمیں عہد نبوی ﷺ سے ملتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ تاریخ انسانی میں منفرد تحریکِ تعلیم کے شروع کرنے والے ہیں۔ آپ نے تعلیم کو انسان کا بنیادی حق اور مسلمان کا بنیادی فریضہ قرار دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کو عام کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی، امت

---

[۱] صدر، اسلامک ریسرچ کونسل پاکستان، لاہور

مسلمہ نے اسے ایک ادارے کی صورت میں منظم کیا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ لکھتے ہیں: ''علم کے لیے نبی کریم ﷺ نے جو بنیادیں فراہم کیں اور جس طرح علوم کی سرپرستی کی، مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو علمی ترقی کی اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے، اس کی اساس، ظاہر ہے عہد نبوی ﷺ کی تیار کردہ بنیاد ہی ہو سکتی تھی۔''

نبی کریم ﷺ نے علمی دنیا کو تعلیم کے لیے جو بنیادیں فراہم کیں، ان تمام کا احاطہ کرنا تو ایک مشکل کام ہے، اس لیے اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ان میں سے چند ایک کو بیان کیا جا رہا ہے۔

علم اور ذرائع علم کی اہمیت

تعلیم کے لیے علم اور ذرائع علم کی اہمیت سب سے بنیادی امر ہے۔ اسی چیز سے نظریہ تعلیم کی بنیاد بنتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس حوالے سے جو بنیاد فراہم کی، وہ آپ پر نازل ہونے والی پہلی وحی سے واضح ہے۔ ''(اے پیغمبر!) اپنے رب کے نام سے (آغاز کرتے ہوئے) پڑھیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا فرمایا۔ اس نے انسان کو (رحمِ مادر میں) جونک کی طرح معلق وجود سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے (لکھنے پڑھنے کا) علم سکھایا۔ جس نے انسان کو (اس کے علاوہ بھی) وہ (کچھ) سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

قلم کی اہمیت

سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''رب تعالیٰ نے انسان کو تعلیم 'قلم' کے ساتھ دی کیونکہ اُس وقت بھی اور آج بھی انسان کی زندگی میں قلم اہم اور موثر ذریعہ تعلیم ہے اور اس حقیقت کو جس طرح ہم آج سمجھتے ہیں، نزول قرآن کے وقت اس طرح نہ سمجھتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ تعلیم اور قلم کی قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ لہٰذا آخری رسول ﷺ کو آخری مشن سپرد کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور قرآن کی پہلی سورۃ میں یہ اشارہ کر دیا گیا۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں: اس کی شانِ کریمی کا ایک جلوہ یہ ہے کہ اس نے قلم کو تعلیم کا واسطہ بنا دیا، علم کی نشر و اشاعت میں قلم کا جو حصہ ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ قدیم زمانے کے علماء

وفضلاء کے علوم کو اگر قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر تحریر نہ کر دیا جاتا تو صدہا سال بعد ہم ان سے کیونکر استفادہ کر سکتے۔ اگر قلم کا واسطہ نہ ہوتا تو آج زمین کے دور دراز گوشوں میں بسنے والے اہل علم کی تحقیقات اور نگارشات سے دُور بسنے والے کیونکر مستفید ہو سکتے۔ یہ قلم ہی کی برکت ہے کہ علم کا کارواں آج ان رفعتوں پر خیمہ زن ہے اور مزید بلندیوں کو مسخر کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔

اہل علم کی اہمیت

نبی کریم ﷺ نے اہل علم کی بھی خصوصی فضیلت بیان فرمائی۔ اس ضمن میں آپ کے چند ارشادات حسب ذیل ہیں:

- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: زمین پر علماء آسمان پر ستاروں کی طرح ہیں جن سے سمندر اور خشکی پر ہدایت حاصل کی جاتی ہے اور جب ستارے چھپ جائیں گے تو قریب ہے کہ ہدایت حاصل کرنے والے بھٹک جائیں۔
- حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عالم کی عابد پر ستر درجہ فضیلت ہے اور ہر دو درجوں کے درمیان آسمان اور زمین جتنا فاصلہ ہے۔
- حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اگر آدمی علم کا ایک باب پڑھ لے تو وہ میرے نزدیک ہزار نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ ان دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب طالب علم کو طلب علم کی حالت میں موت آ جائے تو وہ شہید ہے۔

قرآنی آیات اور فرامین نبوی ﷺ سے یہ بات واضح ہوئی کہ تعلیم کے لیے علماء، علم اور ذرائع علم کی خصوصی اور بنیادی اہمیت ہے، اس لیے اسلامی حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ اساتذہ اور علماء کی فلاح و بہبود پر خصوصی توجہ دے، اور ان کو فکر معاش سے آزاد کرنے کی پالیسیاں بنائے تاکہ وہ خلوص دل اور ملک وقوم کے جذبہ کے تحت علم کی خدمت کر سکیں۔ علم کے لیے تمام ذرائع کو مثبت انداز فکر میں بروئے کار لائے اور خاص طور پر پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کو علم کے فروغ کا ذریعہ بنائے۔

نظریۂ تعلیم کے بنیادی اصول

قوموں کی زندگی میں سب سے اہم مرحلہ نظریہ تعلیم کی تشکیل ہوتا ہے، اسی لیے اسلامی

حکومتوں نے اس پر ہر دور میں خصوصی توجہ دی۔ عہد نبوی کے خصوصی اقدامات اس پر شاہد ہیں۔ نظریۂ تعلیم سے مراد مقصدِ تعلیم ہے کیونکہ یہ امر انسانی زندگی اور معاشرے پر بہت گہرے اثرات چھوڑتا ہے بلکہ معاشرے کی تشکیل میں بھی نظریہ تعلیم ہی اہم سنگ میل ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے مقصد تعلیم کو خصوصی جہت عطا کی ہے، جس کی وضاحت میں ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں: اسلامی نظریۂ تعلیم جامع ہے کہ اس میں انسان کی انفرادی خودی کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی قوت بن کر معاشرتی اجتماعیت کو نشوونما دے۔ اسلامی نظریۂ تعلیم میں تعلیم کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ محض فرد کی اصلاح ہے۔

۲۔ دوسرے پہلو کے لحاظ سے وہ ایسی اصلاح ہے جس کا نتیجہ معاشرتی بہبود ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کا مقصد محبت الٰہی کے نصب العین کو آگے بڑھانا ہے۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنی گرفت رکھتا ہے، وہ فرد کی انفرادی زندگی اور اس کی حیات اجتماعیہ دونوں کی اصلاح کا دعوے دار ہے۔ وہ بامقصد زندگی کا داعی ہے۔ اس لیے وہ کسی ایسے نظام تعلیم کو برداشت نہیں کرسکتا جو اس مقصد کے لیے مفید ثابت نہ ہو۔ قرآن نے انسان کا انفرادی اور اجتماعی مقصد واضح کر دیا ہے: ''تم بہترین اُمت ہو جو سب لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو''۔ اس اعتبار سے تعلیم کا مقصد فرد کی ایسی تعمیر سیرت ہے، جس سے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کائنات کے لیے رحمت ثابت ہو سکے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی تعلیم اور ایسے علم سے پناہ مانگی ہے جس کا اثر انسان کی عملی زندگی پر نہ ہو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے''۔ علم کی نفع بخشی کیا ہے؟ بظاہر یوں لگتا ہے کہ اس بلیغ انداز سے دور حاضر میں تعلیم کے مقاصد میں بالعموم درج ذیل نظریات بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ تعلیم کا مقصد انسانی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما ہے۔

۲۔ تعلیم کا مقصد اجتماعی نصب العین کے مطابق تربیت ہے۔

مقاصد تعلیم میں تعمیرِ کردار، مکمل زندگی کے لیے تیاری، اچھے وجود میں اچھے ذہن کی

نشوونما، جذبہ قوم پرستی کی تشکیل وغیرہ شامل کئے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے علم کی نفع بخشی کا جو تصور دیا ہے اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام پہلو شامل ہیں۔ احادیث میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جن سے انفرادی و اجتماعی تربیت کے اصول نکالے جاسکتے ہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق تعلیم کا مقصد ایسے انسان تیار کرنا ہے جو حب الٰہی، اطاعت رسول ﷺ اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوں۔ گویا اسلام کے نزدیک تعلیم کے مقاصد تین ہیں:

۱۔ فرد کی اصلاح تاکہ وہ بحیثیت عبد اللہ کی عبادت و اطاعت کا حق ادا کر سکے۔

۲۔ تعمیر شخصیت، تاکہ انسان معرفت نفس اور تزکیہ تقویٰ کو پا سکے اور معاشرہ کے لیے سودمند کردار ادا کر سکے۔

۳۔ انسان، ذات سے زیادہ اسلام اور اُمت کا خیر خواہ بن سکے۔

عصرِ حاضر کی اسلامی حکومتوں کو ان امور پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ ہماری درسگاہوں سے فارغ التحصیل طلباء وطالبات کا مطمح نظر صرف انفرادی و مادی منفعت بنتا جارہا ہے جو کہ ملک وقوم کے لیے نقصان دہ امر ہے، اور نظریہ پاکستان کی نفی ہے۔

طلباء کی استعداد و نفسیات کا اصول

نبی کریم ﷺ نے یہ لازمی امر قرار دیا ہے کہ ہر کسی کو تعلیم دی جائے اور طبائع و استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم دی جائے۔ اس کے لیے آپ نے خاص طور پر تنبیہ فرمائی۔ طلباء کی طبائع اور استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف مدارج تعلیم ہونے چاہئیں اور انہی کے مطابق تعلیم کا اہتمام ہونا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشادات سے حسب ذیل امور کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ طلباء و طالبات کی استعداد اور رجحانات کے مطابق شعبۂ علم کا انتخاب کیا جانا چاہیے اور اس کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ شعوری سطح کو بلند کرنے کے لیے اقدامات کرے۔

۲۔ طلباء و طالبات کے لیے اس امر کا جائزہ بھی لینا ضروری ہے کہ وہ جس مضمون یا میدان کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں وہ عملی طور پر معاشرے کے لیے کتنا فائدہ مند ہوگا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۱)

تعلیم و تربیت　　　پروفیسر ملک محمد حسین

اسلامی معاشرے میں جامعات کا کردار
اور اعلیٰ تعلیم کا نصابی فریم ورک

علم کا حصول تمام مسلمان عورتوں اور مردوں پر فرض کیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن میں تحصیل علم ایک ایسی سرگرمی ہے جو ساری زندگی جاری رہتی ہے۔ علم کا حصول اگرچہ جملہ مسلمانوں کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تمام علوم کا حصول فرض کے دائرے میں نہیں آتا۔ علم کا وہ حصہ جو ایک مسلمان کی حیثیت سے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے، فرض عین کا درجہ رکھتا ہے جبکہ اس سے زائد علم یا اس کے کسی جزو کا حصول فرض کفایہ ہے اور معاشرے کی ضروریات کے مطابق بعض افراد معاشرہ اگر اس کا اکتساب کرلیں تو فرض کی ادائیگی مکمل تصور ہوگی۔ ان تصریحات کے مطابق اعلیٰ تعلیم فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہے اور تمام افراد معاشرہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔

جامعات اعلیٰ تعلیم دینے کی خاطر قائم کی جاتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں جامعات کا کردار ایک گائیڈ پوسٹ کے کردار کی مانند ہے، جو قوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ تر منازل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ انہیں حاصل کرنے کا راستہ بھی مہیا کرتی ہیں اور تہذیب و تمدن میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لوازمات مہیا کرتی ہیں اور تحقیق و ترقی کی راہیں پیدا کرتی ہیں۔ تلاش و جستجو اور فکر و اجتہاد کو مہمیز دینے کے ساتھ ساتھ اس کی نشوونما کرتی ہیں اور زندگی کو نئی جہتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ جامعات جمود کی ضد اور تعمیری تغیر کا نشان ہوتی ہیں۔ کسی معاشرے کی ترقی کی رفتار اور اس کی ذہنی، فکری اور روحانی صحت مندی کا انحصار اعلیٰ تعلیم کے ان مراکز پر ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ معاشرے کی زندگی کا انحصار علم پر اور علم کی طاقت کا انحصار جامعات کے متحرک کردار پر ہے۔ اسلام کے نام پر بننے والی ریاست پاکستان کو ریاست مدینہ کی طرز پر تعمیر کے لیے اعلیٰ تعلیم کا کردار اور جامعات کا نصاب خصوصی توجہ چاہتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی دو مختلف بنیادیں ہیں۔ پہلے نقطۂ نگاہ کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا جواز یا جامعات کے تعلیمی پروگراموں کی بنیاد علم برائے علم کی بنیاد پر ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے جواز اور نوعیت کی دوسری بنیاد سیاسی ہے۔ پہلے نقطۂ نگاہ کے مطابق جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا قیام محض علم برائے علم کی بنیاد پر عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس میں تہذیبی تعصبات (Cultural Biases)، قومی ضروریات وترجیحات، نظریاتی اقدار اور انفرادی خواہشات کا منہاج تعلیم میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ تحقیق اور تحصیل علم، بذات خود ایک اعلیٰ قدر کے طور پر سرانجام پاتا ہے۔ یہ سارا عمل Value Free یعنی اقدار کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ دوسرا نقطۂ نگاہ یعنی جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا سیاسی فلسفہ کی بنیاد پر قیام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ حصول علم اور تحقیق وترقیٔ علم قومی ضروریات اور قومی ترجیحات کے تابع ہو۔ معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے میں ممد ومعاون بنے، قومی تفاخر میں اضافہ کرے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے ترقی کی راہیں کھولے اور قوموں کی برادری میں سرفرازی کا باعث بنے۔ یہ نقطۂ نگاہ اقدار کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس میں قومی نظریۂ حیات اور معاشرتی اقدار اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ایک متعین جہت میں ہوتی ہے اور یہ قومی وبین الاقوامی روابط پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی یہ دونوں فلسفیانہ بنیادیں مطلق انداز میں نہ ممکن ہیں اور نہ پسندیدہ۔ ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ کا ایک حسین امتزاج ہی اعلیٰ تعلیم کو ایک صحت مند رخ عطا کرسکتا ہے۔ Epistemoligical بنیاد ''علم'' کو کوئی قابل اعتبار Valid Criterion (معیار کار) عطا نہیں کرسکتی۔ حقیقت کی تلاش اور حقیقت مطلقہ کے مطابق حاصل شدہ علم کی پرکھ اس کے لیے ایک لاینحل مسئلہ رہتی ہے کیونکہ اس نظریہ کے مطابق حقیقت مطلقہ (Absolute Reality) کا علم، اہل علم کے پاس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ روشنی کی تلاش جہالت کے اندھیروں سے کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ خالص سیاسی بنیادوں پر علم کی تشکیل وجستجو بھی کلی طور پر مستحسن نہیں ہے، اس سے محدود اور متعصب نظریات جنم لیتے ہیں۔ گروہی اور بین الاقوامی تضادات میں اضافہ ہوتا ہے اور علم ایک بے رحم ہتھیار کے طور پر دہشت گردی اور استحصال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں نقطہ ہائے نگاہ کا متوازن امتزاج اسلامی نظریۂ تعلیم میں موجود ہے۔ اسلام انسان کو حقیقت مطلقہ کا علم دے کر اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی روشنی عطا کر کے اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی تلاش وجستجو سے حاصل کیے ہوئے علم کو علم وحی کی آفاقی سچائی کی کسوٹی پر پرکھے اور اس کے حسن وقبح کا جائزہ لے کر علمی ترقی کو آگے بڑھائے اور اپنی علمی غلطیوں کا ادراک کر کے تلاشِ مسلسل کا جذبہ حاصل کرے۔ دوسری طرف اسلام ایک آفاقی نظریۂ حیات ہے اور تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس میں محدود گروہی، نسلی، لسانی یا جغرافیہ پر مبنی قومی تعصبات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے اس نظریۂ حیات پر مبنی معاشرتی ترجیحات آفاقی ہوں گی اور تحقیق اور ترقی کے ثمرات بھی پوری نوع انسانی کے لیے میسر ہوں گے۔ اسلامی نظریۂ حیات اعلیٰ تعلیم کے لیے جو فلسفیانہ بنیاد فراہم کرتا ہے، وہ علمی بھی ہے اور سیاسی بھی، اس میں آفاقیت بھی ہے اور متعین سمت بھی۔ اسلامی معاشرے میں جامعات بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے مکمل نشوونما، تیز رفتار مادی ترقی اور ربّ العالمین کی مکمل بندگی کی فلسفیانہ بنیاد پر ہوں گی۔ جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کی فلسفیانہ بنیاد ان کے نصاب تعلیم، ان اداروں کی سماجی زندگی اور ان کے انتظامی ڈھانچے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

قرآن حکیم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو معلمانہ فرائض گنوائے گئے ہیں، ان میں تلاوت آیات، تزکیۂ نفس کرنا، کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا شامل ہیں۔ ہمارے خیال میں تعلیم کے یہ چار عناصر جہاں پورے نظام تعلیم کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں وہیں اعلیٰ تعلیم یا جامعات کے تعلیمی پروگراموں کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر حکمت کی تعلیم تو وہ عمل تعلیم ہے، جس کا تعلق علم کے فہم کے ساتھ ساتھ تجزیہ، تحقیق، تفکر، تدبر، نئی راہوں کی تلاش وجستجو اور مسائل کے حل کے لیے اطلاقِ علم سے ہے۔ اسلامی معاشرے میں قرآن حکیم کی یہ بلیغ اصطلاح جامعات کا کردار متعین کرتی ہے۔ جامعات سے فارغ التحصیل نوجوان کو حکیمانہ طرز فکر اور حکیمانہ طرز عمل کا حامل نوجوان ہونا چاہیے۔

اگر ہم مسلمانوں کی علمی روایات کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو مسلم مفکرین، سائنس دان، اطباء، محدثین، فقہا اور علمائے دین حکمت کا بہترین مرقع نظر آتے ہیں۔ ان کے حکیمانہ طرز عمل کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص سطح تک تمام علوم میں دسترس رکھتے تھے اور

اپنے شعبہ میں حکیمانہ بصیرت کے لیے ضروری روشنی وہ اپنے Broad base Konwledge سے حاصل کرتے تھے جو انہوں نے کسی شعبہ میں تخصص حاصل کرنے سے پیشتر حاصل کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی روایت مختلف شعبہ ہائے علم کی یکجائی کی زیادہ قائل ہے۔ اسلام میں نظریۂ توحید، اسلامی نظام حیات کے ہر پہلو میں رہنما نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ توحید باری تعالیٰ، وحدت کائنات، وحدت حیات اور وحدتِ علم کی متقاضی ہے۔ علوم کی موجودہ شعبہ جاتی تقسیم کائنات کا آفاقی فہم حاصل کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مسائل زندگی کو حکمت وبصیرت کے ساتھ حل کرنے کے لیے علوم وفنون کی موجودہ صورتِ حال سے دو چار علماء اور محققین عاجز نظر آتے ہیں۔ اس لیے عصر حاضر کے اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے تعلیمی پروگراموں کی کثیر شعبہ جاتی (Multi Disciplinary) اور بین شعبہ جاتی (Inter Disciplinary) اپروچ کے مطابق از سرِ نو تشکیل کر رہے ہیں۔ علم کی دنیا میں عصر حاضر کا یہ نیا رجحان اسلامی علمی روایت کی طرف مراجعت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن میں ''حکمت'' اور حکیمانہ رویے کا جو مطلب سمجھا جاتا رہا ہے وہ یہی ہے کہ وسیع البنیاد علم، کثیر الجہات علم یا بین شعبہ جاتی علم کی بنیاد پر تجزیہ وترکیب سے کام لے کر مسائل کا حل دریافت کیا جائے۔

مغرب نے علم کی روشنی، اسلام کے دورِ عروج کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے حاصل کی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون سے حکمت غائب ہوتی گئی اور میکانکی تحقیق اور شعبہ جاتی تقسیم آہستہ آہستہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ مغربی مفکرین، ماہرین تعلیم اور جامعات کے ذمہ داران نے بھی اب اس علمی حماقت پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ تحقیقی طریق کار میں میکانکی اور ریاضیاتی رویوں کے خلاف ایک آواز اٹھ رہی ہے، علم کی شعبہ جاتی تقسیم اور اعلیٰ تعلیم میں محدود تخصص کے خلاف ایک توانا ردِعمل سامنے آرہا ہے۔ مغربی جامعات میں اب بین شعبہ جاتی اپروچ پر مبنی شعبہ جاتی، ریسرچ سنٹرز اور تعلیمی پروگرامز زیادہ سے زیادہ تعداد میں سامنے آرہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم سے متعلق لٹریچر کی کثیر شعبہ جاتی اور بین شعبہ جاتی اپروچ کے مطابق نصابات اور تعلیمی پروگراموں کی تدوین نو کی باتیں ہو رہی ہیں۔

جدید زندگی پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہے۔ پوری دنیا نے ایک گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ معلومات اور نظریات کا ابلاغ ناقابل تصور حد تک تیز رفتاری سے ہو رہا ہے۔ ماحول کی

آلودگی، ٹیکنالوجی کی وجہ سے استحصال، صحت اور خوراک کے مسائل، معاشی عدم توازن، سماجی ناہمواریاں، اعصابی تناؤ اور اس طرح کے دیگر سیکڑوں مسائل ایک ہمہ گیر حکمت کو بروئے کار لائے بغیر حل ہوتے نظر نہیں آتے۔ ہمہ گیر حکمت کے تحت ان اذہان کی تیاری جامعات کا کام ہے جو ان کے ہمہ گیر اور وسیع بنیادوں پر علمی پروگراموں کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔

ترقی پذیر معاشرے میں جامعات کا کردار

ترقی یافتہ معاشرے اپنی ترقی کے لیے علوم وفنون کی اعلیٰ درسگاہوں کے مرہون منت ہیں۔ مغرب کی خیرہ کن ترقی، امریکہ کا دنیا میں قائدانہ کردار اور جاپان، کوریا اور چائنا کی دنیا پر چھائی ٹیکنالوجی اور معاشی فتوحات، جامعات اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پذیر معاشرے محض نقالی اور ٹیکنالوجی ٹرانسفر کی بھیک سے بلندیوں کی طرف بھاگتی ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جب تک جامعات میں کیا گیا بنیادی علمی کام، ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کرے گا تب تک کوئی ترقی پذیر معاشرہ تیز رفتار ٹیکنالوجیکل دوڑ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ان معاشروں میں جامعات کو نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں کی جامعات کا سارول ادا کرنا ہے، بلکہ ترقیاتی خلا کو پاٹنے کے لیے خصوصی حکمت عملی بھی وضع کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے جاپان، کوریا اور چین کی عملی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

ترقی پذیر معاشروں میں صرف مادی پس ماندگی کے مسائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں بے شمار معاشرتی مسائل بھی ہیں جو جدید اور قدیم طرز زندگی کے تضادات سے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں قومی تشخص اور قومی نظریہ کی جدید تناظر میں تعبیر نو کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ اور اس جیسے سیکڑوں مسائل ہیں جن کے حل کے لیے جامعات نے علمی وعملی رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ ان معاشروں میں مقامی وسائل کو بروئے کار لانے کا مسئلہ بھی ہے جو ترقی کی دوڑ میں ان کے حقیقی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے یا اسلامی معاشرے میں مذکورہ تمام امور بنیادی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں جامعات کا کردار

اسلامی معاشرہ ایک فلاحی شورائی معاشرہ ہوتا ہے جس میں علم کے حصول، اس کی ترویج

وترقی اور تحقیق وجستجو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عام انسان کی فلاح اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تحقیق وترقی کے ساتھ انسانی روابط، معاشرتی تعلقات اور ان سے متعلق معاشرتی مسائل پر بھی تحقیق کی جائے۔ اسلام دنیا میں قیادت کرنے کے لیے اور تمام باطل ادیان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ قیادت اور غلبہ کا یہ کام علم کی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان شعبہ ہائے علم کے متعلق انسان کو وحی کے ذریعے معلومات بہم پہنچادی ہیں جن تک انسان کی رسائی یا تو ناممکن تھی یا محدود رسائی کی وجہ سے صحیح نتائج تک پہنچنا ناممکن تھا، لیکن علم کی ان دنیاؤں کو انسان کی تحقیق وجستجو اور مطالعہ ومشاہدہ کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے جنہیں جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلاحیتیں ودیعت کردی ہیں اور ساتھ ہی ان صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرنے کی قرآن حکیم میں بار بار تلقین بھی کی ہے۔ پس اسلامی معاشرے میں علمی تحقیق اور جستجو قیادت وسربلندی کا اوّلین زینہ ہے۔ اللہ کے عبد اور نائب کی حیثیت سے اور شورائی تصور مملکت اور انتظام کی بدولت ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اجتماعی معاملات اور کارہائے مملکت میں رائے دینے کا اہل ہو، صحیح فیصلہ کرسکے اور اپنی قوت فیصلہ حق کے پلڑے میں ڈال سکے۔ گویا بعض معاملات میں ہر فرد اور بعض معاملات میں افراد کی ایک جماعت معاملاتِ زندگی، مسائلِ حیات اور اختلافی ونزاعی معاملات میں اہل الرائے کا درجہ رکھتی ہو۔

یہ سب کچھ وسیع علم، درست طریقِ استنباط اور موثر صلاحیتِ ابلاغ پر مبنی ہے۔ علم اور اس کی ہمہ پہلوترویج ان تمام ضروریات کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ جامعات علم کی انہی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اور کوئی بھی اسلامی معاشرہ جامعات کے اس متحرک کردار کے بغیر نہ تو قائم رہ سکتا ہے اور نہ قیادت وغلبہ کا تصور ہی کرسکتا ہے۔ جامعات علمی بنیاد پر مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور معاشرے کو خوشحال بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ جامعات کے لیے تدوین نصاب میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عصر حاضر کے اسلامی معاشروں کے وہ کون کون سے مسائل ہیں جو اہل علم کی توجہ کا باعث ہونے چاہئیں اور جو اسلامی معاشروں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور نوعیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

اسلامی معاشروں کی ضروریات

۱۔ مسلم ممالک عام طور پر بیماری، غربت اور جہالت کا شکار ہیں۔

۲۔ سیاسی عدم استحکام تقریباً اکثر ممالک کا اوّلین مسئلہ ہے۔

۳۔ مسلم ممالک مجموعی طور پر بیرونی جارحیت کا شکار ہیں یا اس کے خوف میں مبتلا ہیں۔

۴۔ سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی مادی ترقی کی دوڑ میں مسلمان معاشرے آخری صفوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

۵۔ اندرونی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تضادات مسلمان معاشروں کو ہر پہلو سے تناؤ میں مبتلا کرنے کا باعث ہیں۔

۶۔ جاہلی نظریات کا نفوذ مسلمان معاشروں کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اور نظریاتی آلودگی ایک اہم مسئلہ ہے۔

۷۔ جاہلی نظریہ ہائے حیات کے مقابلہ میں بزدلانہ اور معذرت خواہانہ روّیہ مسلم امت کے باوقار تشخص کو بُری طرح مجروح کر رہا ہے۔

۸۔ جدید عمرانی، معاشی اور ٹیکنالوجیکل تناظر میں اسلامی نظریۂ حیات کی ترجمانی اور اطلاق کے سلسلے میں مسلمان معاشرے علمی تہی دامنی کا شکار ہیں۔

۹۔ بعض اسلامی معاشرے اور ممالک جاہلی بنیادوں پر آپس میں مسلح ٹکراؤ کا شکار ہیں

۱۰۔ دشمن، اسلامی دنیا کے وسائل کا بری طرح استحصال کر رہا ہے۔

اجتماعی مسائل کے ساتھ ساتھ اگر ہم مسلم یوتھ کی انفرادی ضروریات پر بھی نظر ڈالیں تو جامعات کا علمی کردار متعین کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی اور تعلیمی و تحقیقی منہاج متعین کرنے میں رہنمائی ملے گی۔

مسلمان نوجوان کی انفرادی ضروریات

ایک مسلمان نوجوان کی بعض اہم انفرادی ضروریات کا خاکہ درج ذیل ہے:

۱۔ ایک مسلمان، مومن اور مجاہد فرد کی حیثیت سے بندگی ربّ کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر اسلامی نظریۂ حیات کی ضروری معلومات اور ان معلومات کو اپنے روزمرہ عمل میں ڈھالنے کا جذبہ۔

۲۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جدید دنیا کا عمومی علم۔

۳۔ تنقیدی اور تحقیقی ذہن۔ ۴۔ خود اعتمادی اور مسلمان ہونے پر فخر۔

۵۔ پیداواری صلاحیتوں سے مزین صحت مند شخصیت۔

۶۔ نئے علوم کی دریافت اور تحقیقی سرگرمیاں اختیار کرنے کی صلاحیت اور جذبہ۔

۷۔ قیادت وسیادت کی اہلیت۔ ۸۔ موثر ابلاغ کی صلاحیت۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام دنیا میں قیادت کے لیے آیا ہے اور تمام ادیان باطل پر غلبہ حاصل کرنے کا فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ انسانوں کو دنیاوی خداؤں کے طوق غلامی سے آزاد کرا کر ایک ربّ العالمین کی غلامی میں آنے کے لیے سوچنے کا اور فیصلہ کرنے کا آزاد موقع فراہم کریں۔ انسان کو انسان کے استحصال سے بچائیں۔ دنیا سے جہالت کے اندھیرے دور کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ گویا مسلمانوں کی صرف قومی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ عالمی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علم کا ہتھیار سب سے موثر ہتھیار ہے۔ اس پہلو سے جو تقاضے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

مسلمانوں کی عالمی ذمہ داریاں

۱۔ باطل ادیان، ان کے سماجی مضمرات، نظریاتی اثرات اور ان کو ماننے والی آبادیوں کا سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ۔

۲۔ بین الاقوامی تضادات، مسائل اور ٹکراؤ کا مطالعہ

۳۔ عالمی سطح پر انسانی مسائل اور قدرتی وسائل کا مطالعہ

۴۔ کمزور اور طاقتور ممالک، اقوام، معاشروں اور گروہوں کا تحقیقی مطالعہ اور ظلم واستحصال کی حکمت عملی۔

۵۔ عالمی سطح پر موثر ابلاغ کی حکمت عملی اور اسلام نظریۂ حیات کو موثر طور پر پیش کرنے کا طریق کار۔

ان مسائل اور تقاضوں پر علمی تحقیق کے لیے ہر شعبہ اور موضوع پر جامعات میں مراکز تحقیق قائم کیے جانے چاہئیں جو پوسٹ گریجوایٹ، ڈاکٹریٹ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ سطح پر ریسرچ کی سہولتیں مہیا کریں۔

پاکستان میں جامعات کا علمی منہاج

گزشتہ سطور میں پیش کی گئی علمی بحث اس بات کی متقاضی ہے کہ پاکستان میں جامعات کے علمی منہاج پر ازسرنو غور کیا جائے۔ اس کے لیے مغرب اور خاص طور پر امریکہ کی علمی روایت سے استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ہمیں اسلامی علمی روایت کو ہی بنیاد بنانا ہوگا۔ تفکر، تدبر اور تعقل کی قرآنی اصطلاحات کو تدریس اور تحقیق کے لیے رہنما اصول بنانا ہوگا۔ حکمت اور تزکیہ جہاں انفرادی اقدارِ تعلیم ہوں گی وہاں اجتماعی ماحول کے لیے بھی حکمت اور تزکیہ کو لازمی حیثیت دینا ہوگی۔ موجودہ تدریسی شعبہ جات کی ترتیب نو کرنا ہوگی اور قومی و بین الاقوامی ضروریات کے پیش نظر تحقیقی مراکز قائم کرنا ہوں گے۔ تفکر، تدبر اور تعقل کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہر شعبہ میں قرآن کی تعلیم اور قرآن کا گہرا فہم ایک لازمی نصابی جزو کے طور پر ہر تعلیمی اور تحقیقی پروگرام کا حصہ بنانا ہوگا۔ قرآن حکیم سائنس یا سماجی علوم کی کوئی کتاب نہیں ہے لیکن اپنی چھے نشانیوں (آیات) کے ساتھ جو قرآنِ حکیم میں بیان کی گئیں، اللہ اپنے بندوں کی سوچ کو فہم کائنات کے لیے ایک سمت مہیا کرتا ہے اور ان نشانیوں سے کام لے کر اہل علم علمی سرگرمیوں کو درست سمت میں ڈھال کر علم اور عمل کی درست راہیں ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ اس طریقے سے نہ صرف فہم کائنات میں مدد ملے گی بلکہ معرفتِ الٰہی کا مقصد حاصل ہوگا جو علم اور تحقیق کا ایک بنیادی مقصد ہے اور جو انسان کے مقصد تخلیق کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ جن چھے قرآنی نشانیوں (آیات) کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ انفس و آفاق کی نشانیاں یعنی کائنات میں طبعی، حیاتیاتی، کیمیائی اور ارضیاتی قسم کی نشانیاں جس میں آفاقی سطح پر طبعی کائنات بھی شامل ہے۔

۲۔ خود انسان کے اندر حیاتیاتی اور نفسیاتی نشانیاں جو اللہ رب العزت نے ودیعت کی ہیں۔

۳۔ بنی نوع انسان کی تاریخ میں پیدائش آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک جو کچھ ہوتا آرہا ہے وہ بھی اللہ کی مشیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے اور یہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۴۔ آفاتِ ارضی وسماوی۔ یہ سب کچھ اللہ کی مرضی اور مشیت سے ہوتا ہے اور یہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور ان کا مطالعہ بھی کائنات کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ انسان کے ضمیر اور نفسیات میں پائی جانے والی نشانیاں، جن کا مطالعہ کئی انکشافات کا باعث بنتا ہے۔

۶۔ قرآن کی آیات کا متن جو بذاتِ خود اللہ کی بڑی نشانیاں شمار کی جاسکتیں اور جن کا ادبی لیول اور جن کے مطالب ومعانی ایسے انکشافات کا باعث بنتے ہیں جن تک محض انسانی علم کی رسائی نہیں ہے۔

ہم نے مختصراً ان جہتوں کا ذکر کیا ہے جن کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم یعنی جامعات کا نصاب ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ ہماری معروضات صرف ایک فریم ورک مہیا کرتی ہیں جن کی بنیاد پر اعلیٰ سطح کے ایک علمی اسلامی ادارے کا تعلیمی پروگرام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ درج ذیل نکات بھی معاونت فراہم کرسکتے ہیں:

۱۔ بی ایس، ایم ایس/ ایم فل اور پی ایچ ڈی لیول پر روایتی کورسز کے آخر میں ایک کورس اس موضوع پر ہونا چاہیے کہ متعلقہ شعبہ علم کے اب تک کے مواد پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیا تبصرہ ہے نیز اس شعبہ علم کی روشنی میں معاشرے کے انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کا اطلاقی سطح پر حل کیا ہے۔

۲۔ تمام ریسرچ ڈگریز کے لیے عربی کا اتنا علم ضروری قرار دیا جائے جسے کام میں لاکر تحقیق کنندہ قرآن وحدیث سے براہ استفادہ کرسکے۔

۳۔ ہر محقق کے لیے لازمی ہو کہ وہ اپنے شعبہ علم کی کوئی معیاری کتاب منتخب کرے جو انگریزی یا کسی اور زبان میں لکھی گئی ہو۔ اس کا اردو ترجمہ کرے اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس پر تنقید وتبصرہ لکھے۔ منتخب کتاب کم از کم دو سو صفحات پر مبنی ہو۔

۴۔ سماجی علوم میں خاص طور پر اردو میں مقالے لکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۵۔ ایک تدریج کے ساتھ نیچرل سائنسز میں بھی پی ایچ ڈی سطح کے مقالے لکھوانے کا اہتمام کیا جائے تا کہ اردو کی علمی حیثیت میں اضافہ ہو۔

۶۔ اردو میں تراجم کیے جائیں گے اور اردو میں مقالے لکھے جائیں گے تو کچھ عرصے کے بعد ہر سطح پر اردو کو بطور تدریسی زبان اختیار کرنے کی سہولت حاصل ہو جائے گی۔

بقیہ: عہد نبوی کے اصولِ تعلیم وتربیت

نصاب تعلیم کے بنیادی اصول

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے لیے نصاب تو مطلق رکھا لیکن ان تمام علوم کے لیے نصاب میں پانچ چیزیں لازم قرار دیں۔

۱۔تلاوت قرآن، ۲۔تعلیم قرآن، ۳۔تعلیم حکمت، ۴۔تزکیہ نفس، ۵۔تسویہ

قرآن حکیم کی سورۃ بقرہ (۱۲۹) اور آل عمران (۱۶۴) میں انہی مقاصد نبوت کو بیان کیا گیا ہے پھر ان کے مطابق آپ ﷺ نے امت مسلمہ کی تعلیم وتربیت فرمائی اور انہی بنیادی تعلیمی اصولوں پر عہد نبوی ﷺ کا نصاب تعلیم وتربیت مشتمل تھا۔

عصر حاضر میں استفادہ

قرآنی آیات اور فرامین نبوی ﷺ سے یہ بات واضح ہوئی کہ تعلیم کے لیے علماء، علم، ذرائع علم، مقصدِ تعلیم اور نصاب تعلیم کی خصوصی اور بنیادی اہمیت ہے، اس لیے اساتذہ اور اہل علم کی فلاح وبہود پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے اور حکومت انہیں فکر معاش سے آزاد کرنے کی پالیساں اپنائے تا کہ وہ خلوص نیت اور مکمل جذبے کے ساتھ اسلام، معاشرے اور ملک کی خدمت کر سکیں (روزنامہ دنیا)۔

تعلیم و تربیت　　پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

جدید اسلامی ریاست میں پرائمری کا نصاب

اس وقت اس موضوع پر کوئی مبسوط مقالہ لکھنا پیش نظر نہیں بلکہ ایک جدید اسلامی ریاست میں پرائمری کا نصاب جن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے ان کی نشان دہی مطلوب ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ:

۱۔ اسلام چھوٹی عمر کے بچوں کی تعلیم و تربیت کو بہت اہمیت دیتا ہے چنانچہ اسلام کا معاشرتی نظام یہ ہے کہ مرد معاشی سرگرمی کے لیے گھر سے باہر کے کام نمٹائے اور عورت گھر میں رہے تا کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کر سکے۔ نماز کی مثال لیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سات سال کے بچے کو نماز کا حکم دو اور تین سال تک ترغیب دیتے رہو۔ دس سال کی عمر میں ڈانٹ ڈپٹ اور تادیب کرو۔

۲۔ اس لیے اسلامی معاشرت میں ڈے کیئر، پلے گروپ اور پری سکول کا تصور نہیں ہے۔ موجودہ پری سکول کا رجحان مغرب سے ہمارے دیکھتے پندرہ بیس سال پہلے آیا ہے جو وہاں کی مخصوص معاشرت اور معیشت کا نتیجہ تھا اور ہمیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ہاں جماعت اوّل میں باقاعدہ داخلے سے چند ماہ پہلے والدین بچے کو سکول بھیجنا شروع کر دیتے تھے تا کہ وہ سکول سے مانوس ہو جائے، اسے سکول جانے کی عادت پڑ جائے اور وہ ابتدائی چیزیں سیکھ لیں۔ اسے 'کچی جماعت' کہا جاتا تھا۔

۳۔ میری تجویز یہ ہے کہ موجودہ حالات میں بچہ جب پری سکول میں جانا شروع کرے تو اسے پہلے تین مہینے مجود قاری سے یا اس کی آڈیو ریکارڈنگ سے قرآنی قاعدہ کا ابتدائی حصہ پڑھایا جائے تا کہ اس کے مخارج درست ہو جائیں اور وہ صحیح طریقے سے قرآن حکیم پڑھ سکے۔ ورنہ ساری زندگی اس کے مخارج غلط رہیں گے۔ اس دوران اسے کوئی دوسری زبان نہ سکھائی جائے۔

۴۔ لسانیات کے حوالے سے ہماری تجویز یہ ہے کہ:

- انگریزی زبان پرائمری میں نہ پڑھائی جائے۔ ہمارا موجودہ رجحان کہ پرائمری میں بلکہ پری سکول ہی سے انگریزی پڑھائی جائے اور سائنسی مضامین میں یہ ذریعۂ تعلیم بھی ہو، انتہائی نقصان دہ اور اَن سائنٹفک ہے۔ دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ذہنی غلامی اور مغربی تہذیب اور اس کی زبان سے مرعوبیت ہے جس سے ہمیں، اگر ہم زندہ قوم ہیں، تو پہلی فرصت میں چھٹکارا پالینا چاہیے۔

- پرائمری میں ذریعۂ تعلیم اردو یا مقامی مادری تحریری زبان ہو جیسا کہ ساری دنیا میں مروج ہے کہ ثانوی زبان عام طور پر یونیورسٹی سطح پر سکھائی جاتی ہے جب اپنی زبان کی لسانی مہارتیں پختہ ہو چکی ہوتی ہیں اور اپنی تہذیبی اقدار شخصیت کا حصہ بن چکی ہوتی ہیں۔

- پری سکول میں قرآنی قاعدہ پڑھا کر پہلی سے چوتھی تک ناظرہ قرآن ختم کرادیا جائے اور پانچویں میں پہلے پارے کا ترجمہ پڑھا دیا جائے اور آخری پارے کی چھوٹی سورتیں ترجمے کے ساتھ حفظ کرادی جائیں۔

- تیسری جماعت سے آسان انداز میں عربی زبان پڑھانے کی ابتداء کردی جائے تاکہ بچوں کو قرآن فہمی میں اس سے مدد ملے۔

۵۔ اسلامیات: علوم اسلامیہ کے مندرجہ ذیل اجزاء لازماً اسلامیات کے نصاب کا حصہ ہونے چاہئیں:

- اسلامی عقائد (توحید، رسالت، آخرت) پر ترکیز تاکہ وہ شخصیت کی ذہن سازی اور تعمیر سیرت کی بنیاد بنیں۔

- قرآنی و مسنون دعائیں جو روزمرہ استعمال میں آتی ہیں، مع عملی مشق کے
- نماز مع ترجمہ و دعائے قنوت و نمازِ جنازہ۔ عملی مشق کے ساتھ
- نبی کریم ﷺ کی سیرت، آسان انداز میں

۶۔ معاشرتی علوم، جنرل سائنس، ریاضی، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے مضامین بھی نصاب کا حصہ ہوں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۱)

تزکیۂ نفس مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام
تزکیہ وتصوف کا کردار

تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق وباد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا اور عالم اسلام کو بزور شمشیر فتح کر لینا اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لیے کہ ساتویں صدی کا عالمِ اسلام ان بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تہذیب وتمدن کے انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہوجایا کرتی ہیں اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی، خونخوار اور خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمہ ہی ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست وپا مسلمان کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی وسیاسی طاقت کھو چکا تھا اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام،(Preaching of Islam) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لیکن اسلام اپنی گزشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا، اور واعظین اسلام نے انہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم اٹھا نا باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا۔ یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلات پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب وغریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنہوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔"[1]

اسلام کے لیے ایسے وقت میں بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا، جس میں بظاہر کامیابی ناممکن نظر آتی تھی۔ مغلوں کے طوفان ہلاکت خیز سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا۔ وہ مشہور ومعروف شہر جو

---

[1] دعوت اسلام (مترجم مولوی عنایت اللہ، ص: ۲۴۱، ۲۴۲)

ایک زمانے میں اسلامی علوم وفنون کا مرکز تھے اور جہاں ایشیا کے ارباب علم وفضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاکستر کردیے گئے تھے۔ مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا توقتل کردیے گئے یا ان کو غلام بنالیا گیا۔(۱) خانانِ مغل جو اسلام کے سوا اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ سخت درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے۔ چنگیز خان نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق ذبح کریں، ان کو قتل کردیا جائے۔ اسی حکم کو قوبلائی خان نے اپنے زمانہ میں از سرنو جاری کیا اور اس کی پیروی کے لیے مخبر اور مخبروں کے لیے انعام مقرر کیے اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہنچائے۔ مفلسوں نے اس موقع پر دولت جمع کرلی اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لیے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا(۲)۔ گیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۴۶ء، ۱۲۴۸ء) جس نے کا انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد کررکھا تھا، مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچیں(۳)، ارغوخان نے بھی، جو چوتھا ایل خان (۱۲۸۴ء، ۱۲۹۱ء) ہوا، مسلمانوں پر ظلم کیے اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر آسامیاں ان کے پاس تھیں، وہ خالی کرالیں اور ان کا دربار میں آنا بند کردیا(۴)۔

باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کرلیا، جس کو انہوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔(۵)

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے۔ جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ

---

(۱) مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کیے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویر دکھاتے ہیں۔ تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے۔

(۲) ہوورتھ ج ۱/ ۱۱۲، ۱۱۱، ۳۷۴ جس وقت یہ دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہوگیا اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا، تو یہ حکم منسوخ کردیا گیا۔

(۳) ہوورتھ، ج ۱/ ۱۶۵

(۴) دی گویس، ج ۳/ ۲۶۵، دعوت اسلام، ص: ۲۴۵، ۲۴۶

(۵) دعوت اسلام، ص: ۲۴۵، ۲۴۶

بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی عظیم کارنامے سے کم نہیں اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انہوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

ہم یہاں مثال کے طور پر صرف چغتائی بن چنگیز خاں کی شاخ میں اشاعت اسلام کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں، پروفیسر آرنلڈ لکھتا ہے:

''بلاد متوسط میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصے میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات کا پتہ کم چلتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی وہ براق خاں تھا، جو چغتائی خاندان کا پرپوتا تھا اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء۔ ۱۲۷۰ء) اپنا نام رکھا[1]، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی۔ چونکہ براق خاں کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انہوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح ہو سکی، البتہ طرمشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۰ء تک سلطنت کی جس وقت مسلمان ہوا تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا اور جب ایک دفعہ انہوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طرمشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے۔ جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم وضعف سے خودمختار ہوگئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی۔ سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خان (۱۳۴۷ء، ۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک صوفی بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر آئے اور انہوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا۔ شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گزر ہوا۔ بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کو

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۱۳/ ۳۴۰

مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے کہا کہ سچ ہے اگر دین حق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔ یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا اب موم کی طرح نرم ہوگیا۔ شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہوگیا۔ لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں گا تو اس وقت تم میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلمرو چغتائیہ کو ملا کر ایک سلطنت قائم کردے۔ اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے اور یہاں سخت بیمار پڑے۔ جب موت کا وقت قریب آیا تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا اسلام پہنچا کر بے خوف وخطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ چند سال کے بعد تیمور تغلق نے باپ کا تخت حاصل کرلیا تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پورا کرے لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی۔ آخر کار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصبح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان دینا شروع کی۔ تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا۔ تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔ اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب

اسلام ہوگیا جو چغتائی ابن چنگیز خاں کے تسلط میں رہتے تھے۔''(۱)

بعض ترکی مؤرخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکاری کتے کی طرف اشارہ کرکے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتا۔ تغلق تیمور کے دل میں یہ بات چبھ گئی اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی۔ اس پر تغلق تیمور نے ان سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا۔ بہرحال اتنا محقق ہے کہ تغلق تیمور کے اسلام لانے اور بالواسطہ کاشغر اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین بنے جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوتِ ایمانی اور اخلاص و درد نے وہ کام کیا جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کرسکتیں۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خانؒ کی یاد میں

اس ملک بے مثال میں اِک مجھ کو چھوڑ کر
ہر شخص بے مثال ہے اور باکمال ہے

ہمارے ذکر سے خالی نہ ہوگی بزم کوئی
ہم اپنے کام کی عظمت وہ چھوڑے جاتے ہیں

گزر تو خیر گئی ہے تیری حیاتِ قدیرؔ
ستم ظریف مگر کوفیوں میں گزری ہے

---

(۱) دعوت اسلام، از آرنلڈ، ص: ۲۵۶

افغانستان مدیر

جنگ ابھی جاری ہے

طالبان اسلحے کی جنگ ائمہ کفر سے جیت گئے۔ الحمدللہ! ان کو اور امت مسلمہ کو لاکھوں بار مبارک باد۔ پچھلی دو صدیوں میں یہ پہلی جنگ ہے جو مسلمانوں نے مغرب کے ائمہ کفر سے جیتی اور یہ پہلی دفعہ ہے کہ ائمہ کفر نے شکست کا مزا چکھا ہے۔ لیکن....

لیکن فکری جنگ ابھی جاری ہے اور یہ پہلی جنگ سے اہم تر ہے کیونکہ اگر طالبان فکری جنگ ہار گئے تو اسلحے سے جیتی ہوئی جنگ بھی بے معنی اور بے سود ہو جائے گی۔

دنیا نے دیکھا کہ ساتویں صدی ہجری میں جیحوں کے پار سے چنگیز خاں کا طوفان اٹھا اور اس نے خوارزم کی متمدن بستیوں میں مسلمانوں کی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کر دیے لیکن وہ لٹیرے اور جنگجو تھے، اسلحہ کی جنگ جیت گئے لیکن وہ کوئی مستحکم فکری روایت نہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف مسلم فکر و تہذیب میں ابھی دم خم تھا، اس نے اگلی ایک صدی میں فاتح منگولوں کے دل و دماغ کو فتح کر لیا اور فاتح منگول مفتوح ہو گئے۔

طالبانِ عالی شان! منگولوں کے واقعے سے سبق سیکھو۔ آپ کی جرأت و شجاعت کو سلام کہ آپ نے آئمہ کفر کو جنگ کے میدان میں شکست دی لیکن مغرب ایک مستحکم فکری روایت رکھتا ہے اور یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اس کی فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے۔ یہ مسلم دنیا پر بھی غالب ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کے دل و دماغ پر بھی غالب ہے۔

لہٰذا ذہن میں رکھیے کہ آپ نے میدان کی جنگ جیتی ہے، فکر کی جنگ ابھی آپ کو جیتنی ہے اور یہ پہلی جنگ سے زیادہ مشکل ہے۔ یہ علم کی جنگ ہے، یہ دلیل کی جنگ ہے، یہ فکر کی جنگ ہے۔ اس کی تیاری کیجیے۔ کمر کس لیجیے۔ آپ کو اس جنگ کو جیتنا ہے۔ مغرب کی فکر و تہذیب کو قبول نہیں کرنا، اس کی مزاحمت کرنی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی فکر و تہذیب کا علم بلند رکھنا ہے، اس کی صورت گری کرنی ہے، اُسے بہر قیمت غالب رکھنا ہے اور قرآن و سنت کے اتباع پر ڈٹ جانا ہے۔

البرہان ایک چھوٹا سا فکری ادارہ ہے۔ ہمارے پاس جو 'خزانہ' ہے ہم آپ کی خدمت میں حاضر کرتے رہیں گے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور اس فکری جنگ میں بھی آپ کو کامیاب فرمائے۔

افغانستان مدیر

دنیا کے طالبان حکومت سے ناجائز مطالبے

مغرب، اقوام متحدہ اور پاکستانی حکومت (عمران خان) افغان طالبان سے دو مطالبے کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مخالفین کے ساتھ مل کر وسیع تر حکومت بناؤ اور دوسرے یہ کہ عورتوں کو مغرب کے طے کردہ حقوق دو۔ یہ دونوں مطالبے ناجائز اور ناانصافی پر مبنی ہیں

طالبان حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ سارے افغان عناصر پر مشتمل حکومت بناؤ۔ انہوں نے ہم خیال ازبک اور تاجک نمائندوں کو شامل کر لیا۔ اس پر مطالبہ ہوا کہ نہیں تم اپنے مخالفین کے ساتھ مل کر وسیع تر حکومت بناؤ۔ یہ مطالبہ سراسر ناجائز ہے۔ ایک نظریاتی حکومت یہ کیسے کر سکتی ہے؟ امریکی صدر جو بائیڈن نے جو حکومت بنائی ہے کیا اس میں اپنی مخالف ریپبلیکن پارٹی کو نمائندگی دی ہے؟ کیا عمران خان پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن سے مل کر حکومت بنانے کو تیار ہیں؟ کیا چینی اور روسی صدر نے اپنے مخالفین کو حکومت میں شامل کر رکھا ہے؟ اگر ان سب کا جواب نفی میں ہے تو طالبان سے یہ مطالبہ کرنا کیسے معقول ہو سکتا ہے کہ جو عناصر بیس سال سے انہیں نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتے آ رہے ہیں وہ ان کے ساتھ مل کر حکومت بنائیں۔

اسی طرح طالبان حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ مغرب نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں تم افغانستان کی عورتوں کو وہ حقوق دو، سراسر نامعقول مطالبہ ہے۔ ہر تہذیب، قوم اور مذہب کے اپنے اصول اور اقدار ہوتی ہیں جن کے مطابق وہ زندگی گزارتی ہے لہٰذا طالبان سے یہ مطالبہ کرنا سراسر ناجائز ہے کہ تم مغرب کی طرح یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو مخلوط تعلیم دو یا دفتروں میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ ملازمت کرنے کی اجازت دو کیونکہ یہ مطالبہ اسلامی اصول و اقدار کے خلاف ہے۔ امریکہ و یورپ نے اقوام متحدہ کے ذریعے بنیادی انسانی حقوق کا جو چارٹر منظور کرا رکھا ہے وہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ہے، اس کی بہت سی شقیں خلاف اسلام ہیں لہٰذا کسی مسلمان حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ تم یہ سارے حقوق اپنی عورتوں کو دو، خلاف عقل و بصیرت ہے۔ آخر مغرب کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ ساری دنیا میں اپنی فکر و تہذیب کو مسلط کرے؟ ہم مغرب کی

سیکولر اور لبرل اقدار کو صریحاً خلاف اسلام سمجھتے ہیں اور مغرب کو یہ حق دینے کو تیار نہیں ہیں کہ وہ دھونس اور دھاندلی سے اپنی اقدار ساری دنیا پر مسلط کرے لہٰذا سارے مسلم ممالک کو مل کر اقوام متحدہ کے بنیادی حقوق کے چارٹر کو رد کر دینا چاہیے بلکہ اقوام متحدہ ہی کو رد کر دینا چاہیے جو مغرب کی لونڈی کا کردار ادا کرتی ہے اور مغربی مفادات کو آگے بڑھاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ افغان حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی عورتوں کو وہ حقوق دے جو مغرب نے دیے ہیں، سراسر ناجائز مطالبہ ہے۔ ہاں! اگر وہ عورتوں کو وہ حقوق نہ دیں جو اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں تو پھر ان پر تنقید جائز ہے اور ان سے مطالبہ بھی جائز ہے۔

بقیہ: جدید اسلامی ریاست میں پرائمری کا نصاب

۷۔ بچیوں کا نصاب ان کی صنفی ضروریات کے مطابق الگ ہونا چاہیے۔

۸۔ بچیوں کے مدارس الگ ہونے چاہئیں اور تعلیم مخلوط نہیں ہونی چاہیے۔

۹۔ طلبہ وطالبات کی یونیفارم اسلامی اور مقامی ہونی چاہیے نہ کہ مغرب کی نقالی پر مبنی۔

۱۰۔ پرائمری کے اساتذہ کو خصوصی ریفریشر کورس کرایا جائے کہ بچوں کی اسلامی تربیت کیسے کرنی ہے اور انہیں مستقبل کا اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے۔

۱۱۔ تربیت

سکول میں لازماً ایک تربیت کمیٹی ہونی چاہیے جو بچوں کی اسلامی تربیت اور صلاحیتوں کی نمو کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔ مسائل کی صورت میں والدین سے رابطہ رکھے۔ بچوں کے اچھے کاموں اور تعمیری رویوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور انعامات دیے جائیں۔

افغانستان

ڈاکٹر محمد امین

بسلسلہ طالبان کو درپیش دو بڑے چیلنج

طالبان کا نظامِ تعلیم کیسا ہونا چاہیے؟

اور ان کی دعوت و اصلاح اور میڈیا کی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

اس مضمون کی پچھلی قسط (جو اکتوبر ۲۰۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی) کا عنوان تھا 'طالبان کو درپیش دو بڑے چیلنج'۔ اس میں ہم نے کہا تھا کہ طالبان کو ایک صحیح اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے بہت سے چیلنج درپیش ہیں جن میں سے ہر ایک اہم ہے اور فوری توجہ اور فوری حل چاہتا ہے لیکن اگر ان کی ترجیحاتی فہرست بنائی جائے تو ہماری رائے میں سرفہرست دو امور ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس پر یکسو ہو جائیں کہ دنیا پر غالب مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہوگا؟ ہم نے عرض کیا تھا کہ عالم اسلام اور مسلم مفکرین نے عموماً اس پر دو طرح کا ردّ عمل دیا ہے کہ یا تو اس فکر و تہذیب کو قبول کر لیا جائے یا اس کی اچھی چیزیں لے لی جائیں اور بُری ترک کر دی جائیں اور یوں اس کے ساتھ توافق اور مفاہمت کی صورت اختیار کر لی جائے۔ حالانکہ ہماری رائے میں یہ دونوں ردّ عمل غلط، ناقص اور ضرر رساں تھے بلکہ ان کا ناکام اور ضرر رساں ہونا اب ثابت بھی ہو چکا ہے۔ اور اس کے خلاف صحیح اور تیسرا ردّ عمل جو سامنے آنا چاہیے تھا وہ یہ ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو اصولاً ردّ کر دیا جائے، اس کی بالادستی کی مزاحمت کی جائے اور امت کے اہل علم قرآن و سنت، امت کے چودہ سو سالہ تجربات اور مسلم معاشرے کی عصری ضروریات کے پیش نظر، زندگی کے ہر شعبے میں نئے فکری و عملی ڈھانچے تشکیل دیں۔

تعلیم اور اس کے اہداف

دوسرا بڑا مسئلہ جو افغان طالبان کی حکومت کو درپیش ہے وہ صحیح نظام تعلیم و تربیت کے قیام کا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل صورتیں اور اہداف بالکل واضح ہیں:

مسلمان عوام کی اصلاح

تحریک طالبان دراصل ایک جہادی تحریک ہے اور جہاد، اگر نیت خالص ہو، تو بلاشبہ نفس

امارہ کو کچل دیتا ہے اور فرد کے دل ونگاہ وروح کو اعلیٰ ترین پاکیزگی عطا فرماتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مجاہدین کی تعداد کم تھی اور ایمرجنسی میں ان کی تعلیم وتربیت کا موقع بھی نہیں تھا لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ جذباتی لحاظ سے اعلیٰ پائے کے مسلمان ضرور تھے اور ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں جذباتی مسلمان سے شعوری مسلمان بنایا جائے کیونکہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ یہ ہر انسان کے اندر چھپے ابلیس کو طاقتور بناتی ہے، اس کے نفس امارہ کو پروان چڑھاتی ہے اور فجور کا جو مادہ ہر انسان کے اندر اللہ نے رکھا ہے، اسے مہمیز کرتی ہے اور للہیت اور تقویٰ کے ہر جذبے کو سلاتی اور کچلتی ہے اور اسے دنیا کی چکا چوند اور مادہ پرستی کی طرف کھینچتی ہے لہٰذا ہر مسلمان کی ایسی تعلیم وتربیت ضروری ہے جو اسے شعوری طور پر مسلمان بنائے، اس الحادی فکر وتہذیب کے خلاف اس کے اندر مزاحمت پیدا کرے، اسے اس کے جال میں پھنسنے سے بچائے اور وہ حبِّ دنیا، مادہ پرستی، معصیت اور جاہ ومال کی فریفتگی سے بچ سکے۔

پڑھے لکھے اور ایلیٹ طبقے کی فکری تطہیر

مزید برآں امریکی ویورپی طاغوت کو افغانستان، خصوصاً اس کے بڑے شہروں میں، بیس سال تک کام کرنے کا جو موقع ملا ہے تو اس نے خواص (Elite) کی خوب برین واشنگ کی ہے۔ جدید مخلوط تعلیم اور مادر پدر آزاد میڈیا کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے اور نیشن بلڈنگ کے نام پر بیوروکریسی، فوج، عدلیہ، سیاستدانوں، کھلاڑیوں اور آرٹسٹوں کی صورت میں معاشرے میں ایک ایسا بالا دست اور جدید پڑھا لکھا طبقہ پیدا کیا ہے جو اسلام کی بجائے سیکولرزم، لبرل ازم اور ان کی اقدار میں زیادہ یقین رکھتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو ملک سے بھاگنا چاہتا تھا (بلکہ اب بھی بھاگنا چاہتا ہے) اور اپنے آپ کو طالبان کے معاشرہ میں Unfit محسوس کرتا ہے۔ خواص کے اس طبقے کی فکری تطہیر کی شدید ضرورت ہے جس کا ذریعہ ظاہر ہے، تعلیم وتربیت ہی ہے۔ کیونکہ ڈنڈے سے لوگوں کو مطیع تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے دل ودماغ کو فتح نہیں کیا جاسکتا جبکہ یہاں اصل ضرورت ان کے دل ودماغ کو فتح کرنے کی ہے۔

اصلاح کی ضرورت

ہم نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں پڑھا تھا (جس کا حوالہ بھی کسی سابقہ تحریر میں دیا تھا) جس میں انہوں نے کہا کہ اگر مجھے اقتدار مل جائے تو (نفاذ حدود سے پہلے) دس سال

تک اصلاح کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ جب تک صحیح اسلامی تعلیم وتزکیہ سے لوگوں کے دل ودماغ اور نفوس کو بدلا نہ جائے اور انہیں شریعت کا متمنی نہ بنا دیا جائے، شریعت کو بطور قانون ریاستی قوت سے نافذ کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں؛ بلکہ ہوسکتا ہے الٹا نقصان ہو اور لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف ردّعمل اور نفرت پیدا ہو، گو حکومت اور معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے وہ اس نفرت کا اظہار نہ کر پائیں لیکن دل سے اسے کبھی قبول نہ کر پائیں گے۔

ہمارا پاکستان کا تجربہ بھی اس کا گواہ ہے کہ یہاں آئین اور قوانین میں بہت سی دفعات اسلامی ہیں لیکن وہ صرف کاغذوں میں موجود ہیں، ان پر عمل کوئی نہیں کرتا۔ نہ حکمران، نہ عوام بلکہ دینی جماعتیں اور علماء بھی دو چار دفعہ مطالبہ کرنے کے بعد خاموش ہو گئے ہیں گویا انہوں نے بھی بادل نخواستہ ہی سہی، اسے قبول کرلیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ لوگوں کے دل ودماغ اور اعمال میں اسلام آیا ہے، نہ معاشرے اور ریاست میں۔

اس صورت حال سے بچنے کے لیے ضروری ہے، بلکہ انتہائی ضروری اور ناگزیر ہے کہ طالبان افغانستان کے عوام وخواص کی دینی تعلیم وتربیت اور ان کی فکری تطہیر کی طرف بھرپور توجہ دیں۔ یہ کام کیسے کیا جائے؟ ہمیں یقین ہے کہ افغانستان میں ایسے اصحاب فکر کی کمی نہ ہوگی جو اس سوال کا جواب دیں یا جنہوں نے اس پر پڑھا، لکھا اور سوچا نہ ہو۔ تاہم دین کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے اور افغان طالبان کا خیرخواہ ہونے کی وجہ سے ہم بھی اس موضوع پر اپنی گزارشات ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ شائد ان میں سے کوئی بات ان کو پسند آجائے یا مفید لگے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اس میں سبق اور دعوت فکر ہم اہل پاکستان کے لیے بھی ہے اور ہمارے حکمرانوں، علماء کرام اور دینی جماعتوں کے لیے بھی کہ عصر حاضر کی ایک ریاست کو اگر اسلامی تناظر میں چلانا ہو تو اس کا نظام تعلیم وتربیت کیسا ہونا چاہیے؟ ہم اس حوالے سے تین عناوین کے تحت اختصار کے ساتھ اپنی گزارشات پیش کرنا چاہیں گے: ۱۔ تعلیم وتربیت ۲۔ دعوت واصلاح؛ ۳۔ میڈیا۔ آج کل کی تعلیمی اصطلاح میں اوّل الذکر کو رسمی تعلیم اور دوسرے وتیسرے نکتے کو غیر رسمی تعلیم کہا جاتا ہے، جبکہ ان کی اہمیت ہمارے زمانے میں رسمی تعلیم سے بھی بڑھ گئی ہے۔

تعلیم وتربیت (وتحقیق)

بیانیہ انداز میں طویل گفتگو کی بجائے ہم چاہیں گے کہ اپنی بات چند نکات کی صورت میں

پیش کریں:

۱۔ ایک مختصر عبوری قومی تعلیمی پالیسی کا فوری اعلان کر دیا جائے (تفصیلی کام بعد میں ہوسکتا ہے) جس میں یہ اعلان ہو کہ ملک کا نظام تعلیم وتربیت اسلامی بنیادوں پر استوار ہوگا جو وحدت تعلیم کی اساس پر کام کرے گا اور عصری ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ یہ جہادی سپرٹ کو جاری رکھے گا اور مغرب کی الحادی اور استعماری فکر وتہذیب کو رد کرے گا۔

۲۔ یہ قومی تعلیمی پالیسی بیک وقت سارے افغانستان میں اور سارے تعلیمی اداروں پر نافذ ہوگی۔

۳۔ ملک کے پرائیویٹ سیکٹر کو حکومت کی منظوری سے تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت ہوگی لیکن یہ اجازت اس قومی تعلیمی پالیسی پر مِن وعَن عمل کرنے سے مشروط ہوگی۔ حکومت پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی سخت نگرانی کرے گی اور یہ یقینی بنائے گی کہ وہ اس قومی تعلیمی پالیسی پر عمل کریں۔

۴۔ موجودہ طرز کے جدید تعلیمی اداروں کو فروغ نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کی سرگرمیاں اس وقت تک محدود رہیں گی جب تک نئے نصابات نہ بنائے جائیں، اساتذہ کی اسلامی تربیت کا انتظام نہ ہو جائے اور طلبہ وطالبات کے لیے الگ عمارتوں کا بندوبست نہ ہو جائے۔

۴۔ تعلیم مخلوط نہ ہوگی اور عورتوں کی تعلیم کے ادارے سکول سے لے کر یونیورسٹی تک ہر سطح پر الگ ہوں گے۔ ان کا نصاب بھی الگ ہوگا۔

۶۔ ہر تعلیمی سطح پر اسلامی تناظر میں نئے نصابات وضع کیے جائیں اور نئی نصابی کتب مدون کی جائیں۔

۷۔ اساتذہ کی تربیت کا بنیادی نکتہ یہ ہو کہ ان کا ہدف اپنے طلبہ وطالبات کو اچھا اور باعمل مسلمان بنانا ہے۔

۸۔ تعلیمی اداروں کے سربراہوں (یعنی تعلیمی انتظامیہ) کی تربیت کی جائے اور انہیں بتایا جائے کہ ان کا بنیادی کام تعلیمی ادارے کے ماحول کو اسلامی اصول واقدار پر استوار کرنا ہے۔ تمام ہم نصابی سرگرمیاں بھی اسلامی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترتیب دی جائیں گی۔

۹۔ سکول یونیفارم مقامی ہوگی۔ اساتذہ اور طلبہ کو مغربی لباس پہننے کی اجازت نہ ہوگی۔

۱۰۔ ہر مسجد کو مکتب/ مدرسہ میں تبدیل کر دیا جائے جس میں لڑکوں کا پرائمری سکول ہو جس میں نوشت وخواند اور دیگر علوم کے ساتھ قرآن حکیم کی تعلیم اور اسلامی علوم واخلاق کی تعلیم وتربیت لازمی ہوگی۔

۱۱۔ حسب ضرورت سائنس وٹیکنالوجی اور میڈیکل وانجینئرنگ وغیرہ کی تعلیم بھی نصاب کا حصہ ہوگی۔

۱۲۔ دینی مدارس کے موجودہ نظام کو باقی رکھا جائے گا لیکن ان میں وحدت تعلیم کے تصور کے مطابق ضروری اصلاحات کی جائیں گی یعنی مسلمانوں کے بارہ سو سال تک مروج رہنے والے نظام تعلیم کے مطابق ان میں پورے دین کی تعلیم دی جائے گی مطلب یہ کہ ان میں قرآن وحدیث وعربی زبان کے علاوہ معیشت، معاشرت، سیاست، دعوت وابلاغ عامہ، فقہ وقانون، بزنس وتجارت وغیرہ کی تعلیم بھی اسلامی تناظر میں دی جائے گی۔ مغربی فکر وتہذیب کا تفہیمی وتنقیدی مطالعہ اور مغربی علوم کا تعارفی مطالعہ بھی شامل نصاب ہوگا۔ دینی مدارس کی ڈگریوں کو حکومت تسلیم کرے گی اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء معاشرے اور ریاست کے سارے اداروں میں کام کرنے کے اہل ہوں گے۔

۱۳۔ ذریعۂ تعلیم مقامی زبانیں ہوں گی۔ تیسری جماعت سے قرآنی عربی لازمی ہوگی۔ حصہ مڈل سے اردو اور انگریزی اختیاری زبانیں ہوں گی۔

۱۴۔ نظام تعلیم کا ہدف طلبہ کی تربیت اور تزکیۂ نفس ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہر تعلیمی ادارے میں ایک 'تربیت کمیٹی' قائم کرنا لازمی ہونا چاہیے۔

۱۵۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا ہدف عصر حاضر میں اسلام کو قابل عمل بنا کر پیش کرنا اور ثابت کرنا ہو۔ مسلم زوال کے اسباب کا مطالعہ، عروج کی حکمت عملی، مغربی فکر وتہذیب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ اور علمی سطح پر اس کا رد، نیز افغان معاشرے کو درپیش ہمہ نوع مسائل کو اسلامی تناظر میں حل کرنا، تحقیق کے اہم مقاصد میں شامل ہونا چاہیے۔

دعوت واصلاح

۱۔ سارے دینی مدارس اور مساجد کے علماء کرام ہفتے میں ایک دن اپنی بستی میں اور قرب

وجوار میں دعوت دین کے لیے مختص کریں گے جس کی نگرانی حکومت کا شعبہ'دعوت وارشاد' کرے گا جو وزارت مذہبی امور کے تحت کام کرے گا۔

۲۔ خطبات جمعہ کو مؤثر بنایا جائے گا اور انہیں اسلامی تعلیم وتزکیہ، اصلاح اخلاق ومعاشرت اور قومی یکجہتی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

۳۔ حکومتی سرپرستی میں علماء وصلحاء مدارس ومساجد کے علاوہ پورے ملک میں خانقاہوں اور تربیت گاہوں کا نظام قائم کریں گے تاکہ لوگوں کے فکر وعمل کی اصلاح ہو سکے اور ان کے نفوس کا تزکیہ ہو سکے۔

۴۔ حکومت وزارت مذہبی امور کے تحت 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کا شعبہ قائم کرے گی۔ یہ شعبہ ملک میں معروف کے فروغ اور منکرات ونواہی کے استیصال کے لیے کام کرے گا۔

۵۔ تعلیم، ادب اور میڈیا کے سارے شعبوں کو دعوت واصلاح کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

ذرائع ابلاغ

۱۔ اس میں پرنٹ، الیکٹرانک، سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ وموبائل وغیرہ سب شامل ہیں۔

۲۔ ذرائع ابلاغ کا بنیادی مقصد عوام کی تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح ہوگا۔

۳۔ تفریحی پروگرام اسلامی حدود، شائستگی، وقار اور مقامی روایات کے مطابق ہوں گے۔ ان سے فحاشی وعریانی پھیلانے اور اخلاق ومعاشرت تباہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۴۔ حکومت ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول رکھے گی۔ پرائیویٹ سیکٹر بھی حکومتی اجازت سے کام کر سکے گا اور حکومت کی ثقافتی پالیسی اور شرائط کی پابندی اس کے لیے لازم ہوگی۔

۵۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اصول واقدار کی تشہیر ممنوع ہوگی۔

۶۔ جامعات کے میڈیا کے شعبوں میں زیر تعلیم طلبہ اور عامل صحافیوں کے لیے اسلامی تناظر میں پروفیشنل تربیت کا اہتمام ہوگا۔

هذا من عندنا والعلم عند الله

افغانستان

ڈاکٹر محمد امین

طالبان اور اسلام کا معاشرتی نظام

اسلامی معاشرے میں خواتین کا کردار

مغربی تہذیب کے مقابلے میں علماء اور دینی جماعتیں پسپا ہوئی ہی تھیں، اب طالبان کیوں پسپا ہو رہے ہیں؟

مغرب میں خواتین کا کردار

ماضی کی تہذیبوں اور قوموں کے زوال کا ایک سبب خواتین کے بارے میں افراط وتفریط کا رویہ تھا۔ مغرب کی تہذیب الحادی بھی ہے اور مادی بھی۔ جب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو رد کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں جلد یا بدیر نفسانی قوتیں اور شہوانی خواہشیں انسانی عقل وشعور پر غالب آ جاتی ہیں اور وہ انسان ہونے کے باوجود اپنی حیوانی خواہشیں حیوانوں کی طرح پوری کرنے لگتا ہے۔ اس کی مثال مغربی فکر وتہذیب پر مبنی معاشرہ ہے جس میں مرد نے پہلے عورت کو کھلی آزادی دی (لبرل ازم، عورت ومرد کی مساوات، عورت ومرد کا شانہ بشانہ کام کرنا وغیرہ) تاکہ وہ خوب مزے لے سکے اور کوئی دین وشریعت اس کی راہ نہ روکے۔ پھر صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جب سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آیا تو اسے سستی لیبر کی تلاش تھی۔ چنانچہ عورتوں کو گھروں سے نکال کر فیکٹریوں اور دفاتر میں (مردوں کے مقابلے میں) کم تنخواہ پر لایا گیا۔ پھر اسے اپنی پروڈکٹ کو زیادہ بیچنے کے لیے حسین چہروں کی تلاش تھی تو عورتوں کو سیلز گرلز بنا دیا گیا۔ پھر پورا معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی سیٹ اپ ایسا بنایا گیا جو اس نقطۂ نظر کی ترغیب وتعلیم دے مثلاً عورت کو جب نوکری کرنی ہے اور گھر بھی سنبھالنا ہے تو اسے کہا گیا کہ بچوں کے جھنجٹ میں نہ پڑو۔ اس کو ایسی تعلیم دی، ایسے علوم وفنون سکھائے گئے کہ اسے بآسانی ملازمت مل سکے۔ پوری کاسمیٹک انڈسٹری بنائی گئی جو اس کو حسین بنا کر پیش کرے۔ ماں کے پاس بچے پالنے کا وقت نہیں تو اس کے لیے ڈے کیئر سنٹر قائم کیے گئے، سکول میں پلے گروپ بنائے گئے، بڑھاپے میں خدمت کے لیے اولاد نہ ہو تو اس کے لیے اولڈ ایج ہومز بنائے گئے....وغیرہ وغیرہ

اسلام میں خواتین کا رول

اس کے مقابلے میں اسلام نے عورت کو جو حیثیت دی اور اس کے لیے جو معاشرتی اور معاشی نظام وضع کیا وہ مغربی فکر و تہذیب کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام نے قرار دیا کہ کسب رزق اور گھر سے باہر کے مشقت طلب کام مردوں کے ذمہ ہیں۔ بیوی بچوں کی کفالت بھی مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ ٹِک کر گھر میں بیٹھے۔ بچوں کی اسلامی تربیت کرے اور خاوند کے لیے گھریلو ماحول کو خوشگوار بنائے۔ اور اگر اسے کسی ناگزیر کام کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہو تو جسم اور چہرہ چھپا کر باہر نکلے، بناؤ سنگھار کر کے نہ نکلے۔ اس طرح اسلام نے مخلوط معاشرت کا راستہ بند کر دیا۔ تجارت و ملازمت وغیرہ میں عورتوں کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا۔ جہاد، حج اور سیاسی و معاشی سرگرمیاں تو رہیں ایک طرف نماز جیسی بنیادی عبادت میں بھی عورتوں کے مسجدوں میں جانے کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عورتیں عشاء اور فجر کی نمازوں میں مسجد جاتی تھیں۔ اُن دنوں کے پاکیزہ ماحول کے باوجود جب ریپ کے بعض واقعات ہوئے تو حضرت عمرؓ نے عورتوں کے مسجد میں جانے کی حوصلہ شکنی شروع کر دی۔ عورتوں نے جا کر حضرت عائشہؓ سے شکایت کی تو انہوں نے حضرت عمرؓ کی حمایت کی۔ قرآن و سنت کی ان تعلیمات پر مسلمان معاشرہ بارہ صدیوں تک کاربند رہا۔ اس کے نتیجے میں مسلم خاندان مستحکم اور معاشرتی نظام پاکیزہ رہا۔

دورِ زوال میں

جب مسلمان زوال پذیر ہوئے اور مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار اسلام و مسلم دشمن مغربی ممالک نے مسلمان ملکوں کو غلام بنالیا تو انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی ڈھانچے کو، نظام تعلیم و تربیت کو، سیاسی و معاشی نظام.... کو بھی توڑ ڈالا اور پورے نظام زندگی کی اپنی الحادی فکر و تہذیب کے مطابق تشکیل نو کی۔ غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمان اپنی فکر و تہذیب سے کٹ جائیں، اپنے دین سے دور ہو جائیں اور ان کی فکر و تہذیب کو اپنالیں۔ مسلمانوں کے کمزور طبقے ان سے متاثر بھی ہوئے لیکن دینی رہنماؤں نے معاشرتی حوالے سے اور خصوصاً خواتین کے حوالے سے مغربی فکر و تہذیب کی اقدار و روایت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس سلسلے میں روایتی علماء کی صلابت تو مشہور ہے ہی، ہم چند جدید علماء و سکالرز کا طرزِ عمل آپ کو بتاتے ہیں۔ حالی نے 'حیاتِ جاوید' میں

لکھا ہے کہ سرسید جو مسلمانوں کی جدید تعلیم کے علمبردار تھے، عورتوں کو جدید مغربی تعلیم سے دور رکھنے کے زبردست حامی تھے۔ علامہ اقبال کو انگریزوں نے جب سر کا خطاب دیا تو تقریب میں لیڈی اقبال کے ساتھ آنے پر اصرار کیا۔ اقبال نے انکار کردیا اور کہا کہ اگر یہ شرط ہے تو میں خطاب لینے تقریب میں آؤں گا ہی نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ عورتوں کے مخلوط پارلیمنٹ کا رکن بننے کے خلاف تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ عورتوں کی الگ پارلیمنٹ ہونی ہیے۔ راقم ۱۹۶۷ء میں جب لاہور آیا تو اس کی رہائش گوالمنڈی میں تھی اور نزدیک ہی واقع عبدالکریم روڈ کی مسجد میں مولانا مودودیؒ کا ہفتہ وار درس قرآن وحدیث ہوتا تھا۔ راقم اس میں باقاعدگی سے حاضر ہوتا تھا اور بسا اوقات منتظمین کے ساتھ مسجد سے باہر مولانا کے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا۔ مولانا اپنی کار میں آتے تو عموماً ان کے ساتھ دو خواتین ہوتیں (غالباً اہلیہ اور بیٹی) جو برقع میں ملبوس ہوتیں۔ راقم نے ۱۹۸۷ء میں ایک سال جاوید غامدی صاحب کے ساتھ کام کیا[1]۔ ایک دن ہم بیٹھے تھے اور مسلمانوں کی معاشرتی روایات اور پردے کے رواج کا ذکر ہو رہا تھا تو جاوید صاحب کہنے لگے کہ اگر میں کہوں بھی کہ موجودہ برقع کی جو شکل ہے اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں تو بھی میری بیوی برقعہ پہننا اور پردہ کرنا نہیں چھوڑے گی۔

علماء اور دینی جماعتوں کی پسپائی

یہ باتیں اپنی جگہ لیکن اس تلخ حقیقت کو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلمان علماء نے عموماً اور جدید اسلامی سکالرز نے خصوصاً اسلامی معاشرے میں عورت کے کردار کے حوالے سے مغربی تہذیب کے اثرات بد کو کسی نہ کسی حد تک قبول کیا ہے۔ انہوں نے اسلامی اصول واقدار کی ایسی وضاحت اور تشریح وتاویل کی ہے جس سے مغربی تہذیب کے اصول معاشرت کے قبول کرنے کی راہ کھلی ہے۔ اکثر جدید دینی تحریکوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور جمہوری سیاسی نظام کو اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور اسلام اور مغرب کی لادین تہذیب کو ملا کر 'اسلامی جمہوریت' اور 'اسلامی بنکنگ' جیسے اداروں کو مسلم معاشروں کے لیے

---

[1] اُس وقت ان کے موجودہ جوہر نہ کھلے تھے البتہ اس کے جراثیم موجود تھے چنانچہ ایک سال ہی میں میرے ان سے اختلافات بڑھ گئے۔ ان کے نظریہ حدیث وسنت پر ایک دن ان سے شدید بحث ہوئی اور پھر ہمارے راستے جدا ہو گئے۔

قابل قبول گردانا ہے۔اسی طرح وہ عورتوں کی مخلوط تعلیم،غیر مردوں کے ساتھ ملازمت اور گھر سے باہر کام کرنے کو جائز سمجھنے لگے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اور ایران میں رضا شاہ پہلوی نے عورتوں کے برقعے زبردستی اتروائے۔بعد میں جامعہ ازہر کے علماء نے تاویل کی کہ چہرے کا پردہ ضروری نہیں۔سر پر سکارف اور جسم پر عبایا پہننے سے پردے کے احکام پر عمل ہوجاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں مسلمان جو مغربی ممالک میں گئے ان کی عورتوں کو برقعہ پہننے اور چہرے کا پردہ کرنے میں مشکلات پیش آئیں تو انہوں نے سکارف کو کافی سمجھنا شروع کر دیا اور کئی علماء نے اس کی حمایت شروع کر دی۔ بلکہ اب تو ایران،مصر، ملائشیا اور دیگر مسلم ممالک بلکہ خود پاکستان میں (خصوصاً بڑے شہروں میں) برقعہ اور چہرے کا پردہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔اکثر دین دار خواتین نے چادر لینا شروع کر دی ہے۔ جہاں تک یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرنے والی طالبات اور ملازمت کرنے والی خواتین کا تعلق ہے وہ دوپٹے کا استعمال کافی سمجھتی ہیں بلکہ اب ایسی نوجوان مسلم خواتین بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو پینٹ شرٹ پہنتی ہیں اور ان کے بال کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اسی طرح اب بڑے شہروں میں دکانوں میں سیلز گرلز، ریسٹورانز اور بسوں میں گرل ویٹرز اور دفتروں میں استقبالیہ پہ خواتین بیٹھی نظر آتی ہیں۔اس میں جہاں مغربی تہذیب کے دباؤ،حکمرانوں اور میڈیا و مخلوط تعلیم کا کردار ہے وہیں علماء اور دینی جماعتوں کے تساہل اور کمزور رد عمل کا بھی دخل ہے۔

اس پسپائی کا نتیجہ

عورت کے بناؤ سنگھار کر کے گھر سے باہر نکلنے کا لازمی نتیجہ فحاشی وعریانی اور زنا بالرضا و زنا بالجبر کی کثرت ہے۔مغرب میں عورت یہ سب بھگت چکی۔ وہاں خاندان ٹوٹ چکا، معاشرت تباہ ہوچکی،عورتوں کے بچے کم پیدا کرنے کے رجحان کی وجہ سے آبادی کم ہوچکی۔مخلوط تعلیم، مخلوط ملازمت، ڈے کیئر سنٹر، پری سکول، پلے گروپ، اولڈ ایج ہومز.... وہاں کی معاشرت کو برباد کر چکے۔

مغرب چونکہ اسلام دشمن ہے لہٰذا اب وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اسلامی معاشرت کی اقدار کو چھوڑیں اور اس کی معاشرتی اقدار کو اپنائیں۔اس کے لیے وہ ایسے حکمران،ہم پر مسلط کرتا ہے جو ان کی پالیسیوں بلکہ خواہشات کو آگے بڑھائیں۔میڈیا،مخلوط تعلیم، انٹرنیٹ،موبائل ہمارے

گھروں کو اجاڑ رہے ہیں، خاندان بکھر رہے ہیں، فحاشی وعریانی، زنا بالرضا اور زنا بالجبر عام ہو رہا ہے۔ حکمران اس پر خاموش ہیں اور علماء و دینی جماعتیں ہونق بنی بے حس بیٹھی ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں؟ دینی مدارس و مساجد کے علماء کا اثر عوام میں کم ہو رہا ہے۔ علماء کے اپنے ذہن مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے بے ارادہ ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اکثر مسلمان 'بدرائے' نہیں 'بے رائے' ہیں۔ چونکہ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہی نہیں لہٰذا علماء کو سمجھ ہی نہیں کہ مغربی تہذیب کیا بلا ہے؟ اور اس کے چیلنج کا مقابلہ کیسے کرنا ہے؟ بلکہ مغربی تہذیب کے دباؤ اور اس کے اثراتِ بد کا سیلاب انہیں بھی معاشرے کے ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی بڑے دینی مدارس کے علماء نے انگریزی میڈیم سکول کھول رکھے ہیں جہاں آکسفورڈ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور دینی جماعتوں کے ہزاروں کارکنوں نے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھول رکھی ہیں جو مغربی فکر وتہذیب کے فروغ کا کام کر رہی ہیں۔ ان علماء اور دینی قوتوں سے کیسے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی مزاحمت کریں گی اور وہ مغرب کے سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام.... کے انہدام کی کوشش کریں گی اور اس کے مقابلے میں اسلام کے سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام کی تشکیل نو کریں گی اور ان نظاموں کے روبہ عمل آنے اور ان کے غلبے اور نفاذ کی کوشش کریں گی؟ یہ سب کیے بغیر اقامت دین، اسلامی انقلاب، نظام مصطفیٰ اور نفاذ شریعت.... وغیرہ کے نعرے لگانے سے تو ظاہر ہے اسلام اور اسلامی اصول واقدار غالب نہیں آ سکتے۔

طالبان کیوں پسپا ہو رہے ہیں؟

چلیے مان لیا کہ پاکستان اور عالم اسلام کے علماء، ان کی دینی جماعتیں اور اسلامی تحریکیں مغرب سے مرعوب ہو چکیں، ان سے متاثر ہو چکیں۔ وہ مغربی معاشرت اور اس کی اقدار کو بتدریج قبول کر رہی ہیں لیکن طالبان افغانستان کو کیا ہوا ہے؟ وہ کیوں اسلام کی معاشرتی اقدار کو چھوڑنے کی بات کر رہے ہیں؟

افغان مسلم معاشرے میں عورت کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ کیا یہ امریکہ، یورپ اور اقوام متحدہ انہیں بتائے گا اور وہ اس پر عمل کریں گے؟ یا وہ خود اپنی اسلامی اور مقامی معاشرتی اقدار پر عمل

کریں گے؟ کیا انہوں نے بھی فیکٹریوں اور دفاتر میں ملازمت کرنے کے لیے لڑکیاں تیار کرنی ہیں یا اچھی مسلمان مائیں تیار کرنی ہیں؟ طالبان تو رہے ایک طرف دنیا نے تو آج تک حامد کرزئی، اشرف غنی اور عبداللہ عبداللہ کی بیویوں کی شکل تک نہیں دیکھی۔ افغانستان میں پردے کے بارے میں اسلامی اور مقامی اقدار پر علماء میں کوئی اختلاف نہیں پھر مجلس شوریٰ اور کیبنٹ میں خواتین کی شمولیت کا کیا جواز ہے؟ عورتوں کو تعلیم ضرور دیجیے لیکن وہ جوان کی صنفی ضرورتوں کو پورا کرے۔ لڑکیوں کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں الگ ہونی چاہئیں، ان کا نصاب الگ ہونا چاہیے۔ لاکھوں افغان مرد بے روزگار ہیں لہٰذا عورتوں کو ملازمتیں دینے کا مطالبہ کرنے کی کیا تک ہے؟ جو عورتیں، بطور استثنٰی، کفالت کی مستحق ہیں یا خواتین کی صحت اور تعلیم کے شعبے میں کام کرنا چاہتی ہیں ان کے لیے ریاست اقدامات کر سکتی ہے اور اسے کرنے چاہئیں۔

حاصلِ بحث

خلاصہ یہ کہ طالبان کو معاشرے میں عورتوں کے کردار کے حوالے سے مغرب کا دباؤ رد کر دینا چاہیے اور دنیا کو بتانا چاہیے کہ وہ اپنے معاشرے میں عورتوں کو وہ سارے حقوق دیں گے جو اسلام انہیں دیتا ہے۔ خواتین کے حوالے سے مغرب کے قوانین اور اقدار غیر اسلامی ہیں، وہ انہیں قبول نہیں کر سکتے۔ انہیں دنیا کو بتانا چاہیے کہ خواتین کے حوالے سے مغرب کا کردار متنازعہ ہے وہ ایک مخصوص تہذیب وتمدن کی پیداوار ہے۔ مغرب اور اقوام متحدہ کو مغربی معاشرتی اقدار کی یونیورسلائیزیشن کی بجائے تنوع اور پلورل ازم کو فروغ دینا چاہیے۔ اسی میں حسن، خوبصورتی اور قوموں کی بقا ہے نہ کہ ایک مخصوص تہذیب وتمدن کو ساری دنیا پر جبر اور دباؤ سے مسلط کرنے میں۔

یاد رہے

افغانستان میں طالبان کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے البرہان افغانستان میں نفاذ اسلام کے حوالے سے کثرت سے مضامین دے رہا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف افغان بھائیوں کے لیے ایک پیغام ہے تو دوسری طرف ان میں ایک ہم عصر مسلم ریاست خصوصاً پاکستان میں نفاذ اسلام کے عملی پہلوؤں سے متعلق سامان آگہی ہے۔ مدیر

افغانستان　　جاوید اکبر انصاری

طالبان حکومت قحط سالی کا مقابلہ کیسے کرے؟

آج سامراج افغانستان میں قحط سالی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے تاکہ انقلابی حکومت سامراجی بھیک قبول کرنے پر مجبور ہو جائے اور اس بھیک کی بھاری سیاسی قیمت وصول کی جا سکے۔ اس قیمت کی نشان دہی United Nations Population Fund کی ڈائریکٹر نے واضح کر دی ہے۔ اسی ادارہ نے افغانستان کے دیسی صنعتی نظام میں اپنا قبضہ مستحکم کرنے کی امید کا اظہار کیا ہے اور وہ وہاں کے غذائی نظام پر قبضہ کرنے کا عزم بھی رکھتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے جو بھیک فراہم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں اس کے بدلے میں افغانستان میں عورتوں کی سرمایہ دارانہ آزادیوں کے فروغ کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ اسلامی معاشرت کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں اور عیاشی اور فحاشی کے پھیلاؤ کے لیے حکومت کو مجبور کیا جا سکے۔ لہٰذا غذائی اور صنعتی نظام سے اقوام متحدہ کے اداروں کو بے دخل کرنا انقلابی ضروریات میں سے ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اقوام متحدہ ایک سامراجی ہتھیار ہے جس کو امریکا اور اس کے حلیف اپنی تخریب کاری کے لیے مستقل استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ افغانستان کا غذائی نظام مشکلات میں گھرا ہوا ہے اور بالخصوص آنے والے موسم سرما میں ترسیل خوراک (بالخصوص ملک کے دور دراز علاقوں میں) مشکل ہو جائے گی لیکن نہ یہ ناگزیر ہے کہ افغانستان میں غذائی بحران آئے اور نہ یہ ضروری ہے کہ انقلابی حکومت سامراجی بھیک پر انحصار کرے۔ لیکن یہ یقیناً ضروری ہے کہ غذائی پیداواری اور ترسیلی نظام کی مناسب ترتیب نو کی جائے اور اس ترتیب نو کی ذمہ دار انقلابی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس شعبہ جاتی ترتیب نو کے لیے سوویت یونین کے تجربات (War Communism 1918-1921) مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک سوویت یونین کا غذائی بحران آج کے افغانستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گھمبیر تھا اور

اس پر بخوبی قابو پالیا گیا۔

انقلابی اسلامی حکومت کو غذائی نظام کی ترتیب نو کے لیے مندرجہ ذیل اقدام کرنے چاہئیں:

۱۔ تمام غیر ملکی میڈیا کے نمائندوں کو ملک سے فوراً نکال دینا چاہیے اور اقوام متحدہ کے اداروں کی اشاعتی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دینا چاہیے کیونکہ یہی ایجنسیاں مفروضہ غذائی بحران کی جھوٹی خبریں پھیلا کر عوام کو گمراہ کرتی ہیں۔

۲۔ ملکی میڈیا کو قومیا لینا چاہیے کہ اس میں بیٹھے سامراجی آلہ کار افواہ سازی کی اس مہم کو جاری نہ رکھ سکیں۔

۳۔ مرکزی، صوبائی اور مقامی سطح پر غذائی انتظامیہ کا قیام جو ملکی، صوبائی اور مقامی سطح پر سہ ماہی بنیادوں پر غذائی ضروریات اور رسد کا تخمینہ جلد از جلد لگائیں۔

۴۔ ان تخمینوں کی بنیاد پر ۲۲-۲۰۲۱ء کے لیے ایک ملکی غذائی منصوبہ کی تیاری جو علاقائی سطح پر فراہمی خوراک کی نشان دہی کرے۔

۵۔ اس منصوبہ کی تنفیذ کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا

i۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر ریاستی اجناسی ذخیرہ کا قیام

ii۔ نظام ترسیل خوراک پر ریاستی کنٹرول

iii۔ کاشت کاروں سے فاضل پیداوار (اجناس کی پیداوار کا وہ حصہ جو گھرانے استعمال نہیں کرتے) کو متعین قیمتوں پر خریدنے کا اہتمام یعنی غذائی کاروبار پر ریاستی اجارہ داری کا قیام۔

iv۔ اجناس کی جو قیمتیں ۲۲-۲۰۲۱ء کے لیے متعین کی جائیں وہ ۲۰۲۱ء کی بازاری قیمتوں کے مطابق ہوں۔

v۔ ان اجناس کو خریدنے کے لیے حکومت نئی کرنسی اسلامی دینار استعمال کرے۔

۶۔ اگر کوئی غذائی امداد سرمایہ دارانہ ادارہ فراہم کرے تو وہ براہ راست مرکزی ذخیرہ

اجناس میں جمع کی جائے اور اس کی عوامی ترسیل میں کسی غیر ملکی ادارہ بالخصوص اقوام متحدہ کے اداروں کا کوئی کردار نہ ہو۔

۷۔ بین الاقوامی تجارت کو قومیالیا جائے۔تمام درآمدات اور برآمدات حکومت کے ذریعہ جاری کی جائیں اور تمام زرمبادلہ حکومتی تحویل میں ہو۔

۸۔ اگر ملکی غذائی ضروریات ملکی غذائی رسد سے زیادہ ہوں تو ان کو درآمدات سے پورا کیا جائے۔کوشش کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ غذائی برآمدات مسلم ممالک بالخصوص ایران، ترکی، پاکستان، ملائشیا اور انڈونیشیا سے ہوں۔

۹۔ ایران، ترکی، پاکستان، ملائشیا، انڈونیشیا میں اسلامی جماعتوں، مدرسوں اور مساجد کے ذریعہ افغان غذائی فنڈ قائم کیے جائیں جن میں مخلصین دین سے گزارش کی جائے کہ وہ عطیات، زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کے ذریعہ افغانستان کے حصول خوراک کے لیے رقوم فراہم کریں۔ یہ تمام فنڈ غیر سرکاری ہوں اور جو ممالک افغان حکومت کو تسلیم کرلیں ان میں ان کی کارفرمائی رائج قانونی نظام کے تحت ہو۔

۱۰۔ اس پوری مہم کو غذائی جہاد کا عنوان دیا جائے۔افغان مخلصین دین کو یہ احساس دلایا جائے کہ کافر دشمن اپنی تخریب کاری افغانستان میں غذائی بحران پیدا کر کے جاری رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ملکی، صوبائی اور مقامی سطح پر غذائی انتظامیہ میں زیادہ سے زیادہ علماء، مشائخ، قبائلی سردار، طلبہ اور مخلصین دین شامل کیے جائیں اور یہ بات پھیلائی جائے کہ اجناس کی ذخیرہ اندوزی شرع مطہرہ کے مطابق کبیرہ گناہ ہے اور کاشت کاروں کا فرض ہے کہ فاضل پیداوار حکومت کے متعین کردہ داموں پر مرکزی اور صوبائی ذخیرہ اجناس کے ہاتھ فروخت کریں۔

۱۱۔ مرکزی اور صوبائی ذخیرہ اندوز اداروں کو اپنی حاصل شدہ اجناس نجی کاروباریوں کو فروخت کر دینا چاہیے لیکن غذائی انتظامیہ کی ذمہ داری ہو کہ کاروباری اجناس کو حکومت کے متعین شدہ نرخوں ہی پر فروخت کریں اور فوج کی ذمہ داری ہو کہ ذخیرہ اندوزی کی سخت سے سخت سزائیں دیں۔

۱۲۔ اگر غذائی منصوبہ سے ظاہر ہو کہ غذائی ضروریات ۲۲-۲۰۲۱ء میں مجموعی خوراک رسد سے زیادہ ہیں تو ان کو کم کرنے کے لیے شہروں میں راشننگ کا نظام بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر افغانستان غذائی طور پر خودکفیل ہونے کی پوری استطاعت رکھتا ہے کیونکہ وہاں کی آبادی کی اکثریت اپنا رزق خود پیدا کرتی ہے لیکن انقلاب کے پہلے سال ایک بحرانی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر تاریخ میں کئی مرتبہ اس قسم کے بحرانوں سے کامیابی سے نمٹا جا چکا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ طالبان جو میدان کارزار میں بیس سال تک ڈٹے رہے ہیں حکومتی محاذ پر بھی کامیاب نہ ہو جائیں بشرطیکہ وہ جہاد جاری رکھنے کا مصمم ارادہ قائم رکھیں۔ ہماری دعا ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ وہ مرتے ہوئے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو شکستوں پر شکستیں دیتے رہیں گے۔

یہ جنگ رہے گی جاری
آئی ہے ہماری باری

جمہوریت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادُوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

دِیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اقبال

تفہیم مغرب

جاوید اکبر انصاری

نام نہاد'اسلامی بینکاری' سے طالبان کی حاکمیت کو شدید خطرہ

نام نہاد'اسلامی بینکاری' وہ منحوس حیلہ ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کے زری (monetory) نظام کو سرمایہ دارانہ معیشت میں ضم کرنے کی شرعی گنجائش نکلتی ہے۔آج سے تقریباً بیس سال قبل مولانا سلیم اللہ خان کی قیادت میں علمائے دیوبند اس کو قطعاً حرام قرار دے چکے ہیں اور انہوں نے دو اور دو چار کی طرح واضح کر دیا ہے کہ اسلامی بینکوں اور عام بینکوں کے عقود(Contracts) میں شرع کے نکتہ نگاہ سے کسی نوعیت کا کوئی جوہری فرق نہیں۔

اب خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ حاجی محمد ادریس کی سربراہی میں طالبان کی حکومت افغانستان کے زری نظام کو اسلامی بینکاری کے ہیئتی خطوط کے مطابق مرتب کرے گی اور اس کے نتیجہ میں افغانستان میں ایک سرمایہ دارانہ معاشی نظام غالب آجائے گا۔

سرمایہ داری کیا ہے؟

سرمایہ داری وہ نظام زندگی اور طرزِ حیات ہے جس میں زر (Credit Money) کی گردش معاشرتی عمل کے ہر شعبہ پر بتدریج غالب آتی چلی جاتی ہے۔سرمایہ دارانہ معیشت کا مرکز اور محور وہاں کی فنانشل مارکیٹس ہوتی ہیں۔ان مارکیٹوں کی کارفرمائی کا مقصد سرمایہ کی بڑھوتری (accumulation of capital) کے عمل کو مستقل مہمیز دینا ہوتا ہے۔اور یہ عمل سود اور سٹہ کے کاروبار کو جاری رکھ کر منظم کیا جاتا ہے۔فنانشل مارکیٹس ہر معاشی عمل اور اشیا کی قدر کا تعین اس بنیاد پر کرتی ہیں کہ اس کے وقوع پذیر ہونے کے نتیجہ میں بڑھوتری سرمایہ پر کیا اثر پڑا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فنانشل مارکیٹوں کے ذریعہ سرمایہ کا نظاماتی تحکم قائم اور مستحکم کیا جاتا ہے۔سرمایہ اس دولت کو کہتے ہیں جو مستقل اپنی بڑھوتری کو مہمیز دینے کے لیے گردش کرتی رہتی ہے۔اس وجہ سے ایک انگریز مسلمان عالم حضرت مولانا محمد مارڈیوک پکتھال نے آج سے نوے سال قبل سرمایہ کو "تکاثر" کہا تھا۔سرمایہ دارانہ معاشرے میں حکومت حرص اور ہوس کی قبیح صفتوں کو فروغ دیتی ہے اور حرص وہوس کی یہ خبیث قوتیں اکثر پورے سیاسی اور ثقافتی نظام کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔سرمایہ دارانہ معیشت لازماً ایک سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کی پرورش کرتی ہے۔

اسلامی بینکاری سرمایہ دارانہ ریاست کے قیام کا ذریعہ

ملائشیا کے تمام اسلامی بینک وہاں کے سرمایہ دارانہ مرکزی زری نظام کی ماتحتی میں کام کر رہے ہیں۔ اور پوری دنیا کے تمام اسلامی بینکوں کی طرح ملائشیا کے اسلامی بینک بھی وہاں کے عالمی سود اور سٹہ کے مارکیٹوں کے ڈسپلن کو قبول کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام اسلامی بینکوں کی طرح ملائشیا کے اسلامی بینک بھی سودی اور سٹہ بازی کے عہود کی شرعی جوازیت مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ملائشیا میں کسی مرکزی اسلامی بینک کا نہ کبھی کوئی وجود تھا نہ آج ہے۔

ملائشیا میں دیگر تمام سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح گردشی زر کی مقدار اور اس کی قدر بنیادی طور پر اس کے نجی سود اور سٹہ باز کاروباری متعین کرتے ہیں۔ اسلامی بینک بھی زر کی تخلیق کے اس غلیظ کاروبار میں برابر کے شریک ہیں۔ ملائشیا میں سرمایہ دارانہ زر کا وہ حصہ جو مرکزی بینک تخلیق کرتا ہے اوسطاً ہر سال مجموعی زر Mo کے مقدار کا ایک نہایت قلیل حصہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ زر کی مقدار کا عظیم حصہ سودی کاروبار کے ذریعہ اسلامی اور غیر اسلامی بینک تخلیق کرتے ہیں۔ عملاً ملائشیا کی کرنسی Ringit بھی ویسے ہی غیر مقبول ہے جیسے ڈالر۔ ڈالر کے پیچھے صرف امریکی حکومت کا اعتبار ہے نہ سونا نہ چاندی نہ کوئی شے۔

اسلامی اور غیر اسلامی بینک کاری کے نظام زر کی تخلیق صرف اور صرف بڑھوتری سرمایہ کی رفتار کو مہمیز دینے کے لیے کرتا ہے۔ سود اور سٹہ کے مارکیٹ میں ہمیشہ غیر متوازن ہو جانے کا خطرہ درپیش رہتا ہے۔ جب بھی ادائیگی کے مطالبات سیالیت سے تجاوز کر جاتی ہے مالیاتی بحران رونما کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام زر میں مرکزی بینک نجی بینکوں کا ان معنوں میں ماتحت اور قیدی ہوتا ہے کہ اس کو ہمیشہ سرکاری زر Mo اس مقدار میں تخلیق کرنا پڑتا ہے جو بڑھوتری سرمایہ کے عمل کو جاری رکھنے اور مالیاتی بحران کے امکان کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اسلامی نظام بینک کاری کے پاس مرکزی بینک کی اس نظاماتی بے بسی کو دور کرنے کا نہ کوئی تصور ہے نہ ارادہ۔ کیونکہ اسلامی بینک کاری حرص اور حسد (بڑھوتری سرمایہ) کی نظاماتی حاکمیت کو چیلنج کرنے کا نہ کوئی تصور رکھتی ہے نہ ارادہ۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سیاست اور معاشرت زری نظام کی تابعدار ہوتی ہے اور اسلامی بینک کاری اس تابع داری کو منظم کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کو شرعی حیلوں سے جواز بخشا گیا ہے۔ اسلامی بینک کاری جدیدیت کی کریہہ ترین شکل ہے۔

طالبان کی حکمت عملی

طالبان اسلامی انقلابی ہیں۔ انہوں نے اکیس سالہ جہاد کے نتیجہ میں ایک اسلامی ریاست قائم کی ہے۔ سامراج کی خواہش ہے کہ اس ریاست کو عالمی سامراجی نظام میں ضم کر لے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ 'اسلامی بینک کاری' کا حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنی اس چال میں کامیاب ہو گیا تو اسلامی اقتدار بتدریج سود اور سٹہ کی مارکیٹوں کی طرف منتقل ہو جائے گا اور طالبان سرمایہ کے تعقل کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے چلے جائیں گے۔ سود اور سٹہ کی مارکیٹوں کی کارفرمائی لازماً افغان معاشرتی اور ریاستی نظام کو عالمی سامراجی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کر دے گی جیسے اس نے ملائشیا اور دیگر مسلم ممالک کو ضم کر دیا ہے۔ ملائشیا کی کرنسی کی بیرونی شرح عالمی سودی اور سٹہ مارکیٹوں میں اجارہ دارانہ تجارت سے متعین ہوتی ہے۔ اگر اسلامی بینک کاری کا نظام افغانستان میں قبول کر لیا گیا تو یہی افغانی کرنسی کی قدر کے تعین کا لامحالہ ذریعہ ہوگا کیونکہ بغیر اس کے عالمی بینکوں کا سرمایہ افغانستان کا رخ نہیں کرے گا۔ قومی کرنسی کی بیرونی قدر کا عالمی فنانشل مارکیٹوں میں تعین کا مطلب یہ ہے کہ حکومتی اقتدار اور حاکمیت ان حرام خور مارکیٹوں میں رہن رکھ دی جائے۔

اس ہولناک مستقبل سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ افغان زری نظام پر مکمل اختیار اور اقتدار نجی اسلامی اور غیر اسلامی بینکوں کا نہ ہو۔ زر (Money) اور قرضہ جات (Credit) سب کے سب حکومت تخلیق اور ترسیل کرے۔

۲۔ مرکزی بینک ایک نئی کرنسی جاری کرے جس کا نام اسلامی دینار ہو۔ امریکی ڈالر کی طرح اسلامی دینار بھی غیر متبدل ہو اور اس کا اعتبار حکومت کی ساکھ متعین کرے۔ اس کی مقدار اور شرح تبدل ملکی پیداواری اور ترسیلی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھ کر حکومت وقتاً فوقتاً متعین کرتی رہے۔

۳۔ تمام بینک، انشورنس اور فنانشل کمپنیاں قومیا لی جائیں اور قرضہ جاتی منصوبہ بندی (Credit Planning) کے تحت قرضوں کی ترسیل اور اجرا کا انتظام کیا جائے۔ تمام قرضہ جاتی عقود مضاربت اور مشارکت کی بنیاد پر ہوں۔

۴۔ 'اسلامی دینار' کے علاوہ کسی کرنسی (افغانی، روپیہ، ڈالر) کے استعمال کو جرم قرار دیا جائے اور اس جرم کی سخت سے سخت سزائیں دی جائیں۔

۵۔ کسی فنانشل مارکیٹ کے قیام کی اجازت نہ دی جائے۔ بین الاقوامی سامراجی فنانشل مارکیٹوں سے تمام تعلقات منقطع کردیے جائیں۔آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ایشین بینک اور اقوام متحدہ کے بھیک بانٹنے والے اداروں سے رابطہ ترک کردیا جائے۔

۶۔ تمام بڑی صنعتیں قومیالی جائیں اوران کی قرضہ جاتی ضروریات کریڈٹ پلاننگ کے ذریعہ طے کی جائیں۔

۷۔ معاشی منصوبہ بندی کا انحصار بیرونی ماہرین پر ترک کیا جائے کیونکہ ان میں سے زیادہ سرمایہ دارانہ تعقل کے اسیر ہیں۔ایک وسیع ترین معاشی انتظامیہ قائم کی جائے جس کی تعداد لاکھوں میں ہو۔کوشش کی جائے کہ ہر دفتر، فیکٹری اور ادارہ میں طالبان اوران کے حمایتی نگران کے طور پر کام کریں۔

۸۔ ملک میں جلد از جلد عام لام بندی کا اعلان کیا جائے اور بڑی صنعتوں اور زرعی شعبہ کو ایک جہادی معیشت میں ڈھالا جائے۔

۹۔ طالبان کا انقلاب سرمایہ دارانہ انقلاب نہیں جیسا کہ سوویت روس کا تھا لیکن ہم اسلامی اقتدار کے ابتدائی دور میں سوویت روس کی اس ادارتی صف بندی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو 1918ء تا 1921ء کے دوران کی گئی اور جس نے سوویت روس پر فرانس، انگلستان اور امریکا کی فوج کشی کو اس دور میں ناکام بنادیا تھا۔طالبان کو اس دور کی سوویت ادارتی صف بندی کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

طالبان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جہاد ختم نہیں ہوا بلکہ ایک طاقت ور خود کفیل ریاست اور معیشت کے قیام کے مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے۔سامراج کے پاس اس جہاد کو ناکام بنانے کا ایک ہی ذریعہ باقی بچا ہے وہ یہ کہ اسلامی حکومتی اور معاشی نظام کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم کرلے وہ اعتدال پسند جو سامراجی حکمت عملی کو سمجھے بغیر اس پر عمل درآمد کی کوشش کررہے ہیں۔انقلاب کو ردِ انقلاب میں تبدیل کررہے ہیں۔نام نہاد 'اسلامی بینک کاری' اسی ردِ انقلابی حکمت عملی کے خلاف ایک چال ہے۔اگر یہ چال کامیاب ہوگئی تو طالبان کی عدیم المثال اکیس سالہ جدوجہد کے تمام ثمرات رفتہ رفتہ ضائع ہوتے چلے جائیں گے۔

افغانستان

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

طالبان مغرب کے نظامِ سرمایہ داری سے کیسے بچیں؟

سرمایہ داری ایک ایسا مکمل اور خود کفیل نظامِ حیات اور طرز زندگی ہے جو پوری دنیا پر غالب ہے۔ اس کی اصل وہ الحادی نظریۂ روحانیت، اخلاقیات اور عملیات ہے جو دہریہ تصور مابعد الطبیعیات میں بیان کی جاتی ہے۔ اس دجالی تہذیب کے مفروضات حسب ذیل ہیں:

۱۔ انسان ہیومن بی انگ ہے یعنی ایک ایسا قائم بالذات صمدی وجود ہے جو اپنی ذات اور کائنات خود تخلیق کرتا ہے۔

۲۔ کائنات کا وجود ایک غیر مقصدی حادثہ ہے لیکن کائنات کا وجود ابدی ہے۔

۳۔ حقیقت محسوسات کے وجود تک محدود ہے اور ہیومن بی انگ کی عقل ان محسوسات کے شعور کی بنیاد پر تصورات قائم کرتی ہے۔

۴۔ ہیومن بی انگ کی غالب فطری جبلت حیوانی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنی اس فطری جبلت کا تصرف فی الارض کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اظہار کرتے رہنا ہے۔

۵۔ عقل اس فطری جبلت (نفس امارہ) کی غلام ہے۔ وہ ایسے اخلاقی اصول اور عملی طرق وضع کرتی ہے جن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ہیومن بی انگ زیادہ سے زیادہ تصرف فی الارض کے قابل ہوسکیں۔

ان عقائد کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ انفرادیت و معاشرت کارفرما رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی انفرادیت اور معاشرت ہوتی ہے جہاں حرص، حسد، شہوت اور غضب غالب تمدنی محرکات کا کردار مستقل انجام دیتے رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انسان ہیومن بی انگ بنتے رہتے ہیں اور اپنے قلب اور اپنی عقل کو اپنے نفس امارہ کے سپرد کرتے رہتے ہیں اور اس فاسد عقیدہ کو عملی جامہ پہناتے رہتے ہیں کہ معقول بات یہی ہے کہ اپنے عمل کے ذریعے اپنے اور اپنے معاشرہ کی نفسانی

خواہشات کو پورا کیا جاتا رہے۔ سرمایہ دارانہ معاشروں میں قومی مفاد اسی چیز کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی اسلامی ریاست کے لیے اس تصور قومی مفاد کو قبول کرنا ناممکن ہے۔ امارت اسلامیہ افغانستان کے قیام اور کارفرمائی کا مقصد تمتع فی الارض میں مستقل اضافہ نہیں بلکہ اس کے تمام باشندوں کے لیے اخروی نجات کا حصول ہے۔ لہٰذا امارت اسلامیہ کو ایسی انفرادیت اور معاشرت قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے جس میں اخروی کامیابی کا حصول اصل محرکِ عمل ہو۔ اس کی قومی معاشی پالیسی کا یہی اصل ہدف ہونا چاہیے۔

سلطنت عثمانیہ کے سقوط تک پورے تیرہ سو سال میں ہر اسلامی ریاست نے ایسی ہی معاشی پالیسی اختیار کی اور ان کے باشندے عموماً عمل معاش کو معاد کمانے کا ایک ذریعہ ہی گردانتے رہے۔ لہٰذا مسلم معاشروں میں حرص و ہوس عام نہ ہوئیں اور اسلامی انفرادیت فروغ پاتی رہی لیکن انیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ سامراجی غلبہ نے اسلامی معیشتوں کو تباہ کر دیا۔ سامراجی غلبہ محض عسکری اور سیاسی نہ تھا۔ روحانی اور علمیاتی بھی تھا۔ اس غلبہ کے نتیجہ میں ایک ایسی انفرادیت معاشرہ میں غالب آئی جو تصرف فی الارض میں مستقل اضافہ کو مقصد حیات گردانتی ہے۔ اس انفرادیت کے معاشرتی، ریاستی غلبہ کے نتیجہ میں دہریانہ عقلیت مقبول عام ہوئی اور عوام میں بھی یہ نظریہ عام ہو گیا ہے کہ نفس امارہ کے احکامات کی مستقل غلامی کرتے رہنا عقل کا تقاضا ہے۔ جاہلی علم اکنامکس کے منہج نے معاش کا تعلق معاد سے بالکل منقطع کر دیا ہے اور مسلم ممالک کی معاشی پالیسیاں اسی خبیث منہج کی بنیاد پر مرتب ہونے لگی ہیں۔

ستم ظریفی یہ کہ ترمیم پسند علما نے سرمایہ دارانہ نظام کی اسلام کاری کا بیڑا اٹھایا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمتع فی الارض کی مستقل جدوجہد کرتے رہنا شرعی حدود میں رہتے ہوئے جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اس معذرت خواہی کی پلید ترین شکل نام نہاد اسلامی بینک کاری ہے۔ مولانا تقی عثمانی، پروفیسر خورشید احمد اور ان کے ہم خیالوں نے سود کی مارکیٹ اور سٹے کی مارکیٹ کے لاتعداد کاروباری معاہدوں کا شرعی جواز بیان کیا اور ان معاہدوں پر عمل داری کے نتیجہ میں ہر سال اربوں ڈالر مسلم ممالک سے کافر ملکوں کے بینکوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اسلامی بینک کاری کا

نظام (بالخصوص ملائشیا اور عرب ممالک میں) عالمی سودی اور سٹہ کے کاروبار کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔

آج مولانا تقی عثمانی افغانستان میں اسلامی بینک کاری کے فروغ کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً امارت اسلامیہ عالمی سودی اور سٹہ بازی کے نظام میں ضم ہو جائے گی۔ سود اور سٹہ کے شرعی حیلوں کا سہارا لے کر ایک اسلامی معیشت قائم نہیں کی جا سکتی۔ اسلامی معاشی نظام کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسی انفرادیت عام ہو جو حریص اور حاسد نہ ہو اور جو معاشی عمل کو معاد کمانے کا ذریعہ سمجھے۔ یہ معیشت لازماً ایک جہادی معیشت ہو گی۔

جہادی معیشت کے خدوخال

۱۔ جہادی معیشت کے قیام کا مقصد ایک ایسی انفرادیت کی عمومیت ہے جس کے معاشی عمل کا محرک اخروی کامیابی کا حصول ہو، تمتع فی الارض نہ ہو۔

۲۔ اس نوعیت کی انفرادیت کا معاشرتی غلبہ دھیرے دھیرے اور بتدریج ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ سامراج کے عالمی غلبہ کے دور میں اس قسم کی انفرادیت کا فروغ ریاستی عمل ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ مسلم معاشروں میں یہ سکت نہیں کہ اس نوعیت کی شخصیت کا نظاماتی غلبہ قائم کریں۔

۴۔ امارت اسلامیہ کی ریاستی اشرافیہ (یعنی طالبان) اپنے بیس سال سے جاری عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ حریص اور حاسد نہیں۔ دین کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں اور معاد کو معاش پر ترجیح دیتے ہیں۔

۵۔ لہٰذا ان کا حق ہے کہ وہ ملک کے تمام معاشی وسائل کے استعمال کا ایسا طریقہ وضع کریں جس کے نتیجے میں حرص و ہوس سے پاک انفرادیت عام ہو۔

۶۔ اس انفرادیت کے فروغ کے لیے قومی معاشی منصوبہ بندی لازم ہے۔

۷۔ اس منصوبہ بندی کے ذریعے معیشت کی ہر سطح پر جو ادارتی صف بندی کی جائے اس

میں طالبان، علماء، صوفیا اور مخلصین دین کی قیادت قائم ہو۔

۸۔ اس قیادت کی کوشش ہو کہ معاشی، روحانی اور اخلاقی تربیت کی جدوجہد کو اداراۃً مربوط کرے۔ یہ قیادت لاکھوں علما اور مخلصین دین پر مشتمل ہو اور پورے ملک میں معاشی صف بندی کا ایک ایسا وسیع جال بچھا دے جو ملک کے روحانی اور اخلاقی تربیتی نظام سے مربوط ہو۔

۹۔ ملکی منصوبہ بندی میں یہ پوری کی پوری عوامی انتظامیہ شریک ہو اور ایک فعال کردار ادا کرے۔ ملک گیر معاشی تنظیم کی قیادت اسی عالی قدر روحانی ترفع، ایثار اور قربانی کی مثالیں پیش کرے جو طالبان نے بیس سالہ جہاد کے دوران دکھائی ہے۔

۱۰۔ ملک گیر منصوبہ بندی کے اہداف ملکی جہادی استطاعت میں اضافہ اور عوامی بنیادی ضروریات کی فراہمی ہونے چاہئیں۔

11۔ بنیادی ضروریات سے مراد خوراک لباس، رہائش، توانائی اور تعلیم کی ضروریات ہیں۔ ان ضروریات میں مستقل اضافہ منصوبہ کا ہدف نہ ہو بلکہ ضروریات زندگی میں اضافہ آبادی سے منسلک کیا جائے۔ ملکی معیشت سے تعیشات کا اخراج بھی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی کے منصوبہ کا حصہ ہو۔ منصوبہ بندی مادی وسائل کے تخمینوں کے مطابق ہو، ملک میں زری گردش (Circulation of Money) کے لحاظ سے نہ ہو۔

۱۲۔ جہادی استطاعت میں اضافہ کے لیے ضروری ہے کہ پیداواری اور خدمتی دولت کا وہ حصہ جو تصرفی اخراجات میں خرچ ہو رہا ہے، بڑھتا رہے اور فاضل پیداواری شرح میں مستقل اضافہ ہوتا رہے۔ پیداواری شرح میں مستقل اضافہ ملکی منصوبہ کا کلیدی ہدف ہو۔

۱۳۔ ان اہداف کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی نظام کو اختیار ہو کہ

i۔ وہ زرعی فاضل پیداوار (یعنی وہ جو کاشت کاروں کی ضرورت سے زیادہ ہو) کو بازار میں بکنے کے لیے لائے جانے کی ترسیل کو منظم کرے۔

ii۔ تمام بڑے صنعتی اور قومی ادارے اس کی تحویل میں ہوں۔

iii۔ بین الاقوامی تجارت اور ترسیل زر پر ریاست کی اجارہ داری قائم ہو۔

iv۔ اجرائے زر اور قرضہ جات کے اجراء پر ریاست کا مکمل کنٹرول ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام بینکوں وغیرہ کو قومیا لیا جائے۔ 'اسلامی بینک کاری' کے فراڈ سے گریز کیا جائے اور سود اور سٹہ مارکیٹ کو کالعدم قرار دیا جائے۔

v۔ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام سے تعلق بتدریج منقطع کیا جائے۔ آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او وغیرہ سے افغان حکومت باہر آ جائے۔ اپنے زر مبادلہ کی شرح خود متعین کرے۔ عالمی سرمایہ کاری پر پابندیاں عائد کی جائیں۔

vi۔ قیمتوں کی سطح میں تغیر کا اختیار ریاست کو ہو۔

vii۔ فاضل پیداوار اور دولت کا بڑا حصہ حکومت کی تحویل میں ہو اور حکومت کے پیداواری اور جہادی اخراجات میں مستقل اضافہ ہوتا رہے۔

سامراج اور اس کے حلیفوں کی خواہش ہے کہ امارت اسلامیہ افغانستان عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ بھیک دینے کا وعدہ کرتے ہیں اور اس بھیک کی فراہمی کی دو بنیادی شرطیں ہیں: ایک یہ کہ طالبان افغانستان میں عورتوں کی عریانی، فحاشی اور بدمعاشی کو برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کو عالمی ہیومن رائٹس کی پاسداری کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ حکومت میں سامراجی گھس بیٹھیوں کو شامل کرے۔ عمران خان سامراج کے ان دونوں مطالبات کی حمایت کر رہا ہے۔

اگر سامراج اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تو انقلاب اسلامی کا خواب کبھی بھی پورا نہ ہو سکے گا اور طالبان وہ جنگ جو انہوں نے میدان میں بے مثال قربانیاں دے کر جیتی ہے حکومت کے ایوانوں میں ہار جائیں گے لیکن ہمیں توقع ہے کہ ان شاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہو گا اور طالبان افغانستان میں ایک جہادی معیشت قائم کر لیں گے۔

افغانستان

جاوید اکبر انصاری

طالبان کو جمہوری عمل کیوں رد کر دینا چاہیے؟

ستمبر 2021ء کے آخر میں امارت اسلامیہ کے قائم مقام وزیر اعظم ملا اخوند نے ایک بیان میں فرمایا کہ ان کی حکومت شاہ کے دور کا دستور عارضی طور پر نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ ملک میں جمہوری نظام کے قیام کی ابتدا ہو سکتی ہے اور اس سے اسلامی اقتدار کی جڑیں کھوکھلی ہونے کا خطرہ ہے۔

مسلم دنیا کی بیش تر بڑی غیر مزاحمتی سیاسی جماعتوں نے جمہوری نظام کے تناظر میں ہی اپنی جدوجہد مرتب کی ہے۔ ایران کی اسلامی حکومت اپنے ملک کو جمہوریہ (ریپبلک) کہتی ہے اور وہاں بھی جمہوری عمل شرع مطہرہ کے تناظر میں مقید کیا گیا ہے۔

اسلامی جماعتوں نے جمہوریت کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جمہوری عمل میں شرکت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس شرکت کے بغیر ان جماعتوں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ملکی نظام اقتدار میں مداخلت کر سکیں۔ ان کی اپنی ماس بیس اتنی وسیع نہیں کہ وہ جمہوری عمل کا متبادل منظم کر سکیں۔ میری رائے میں (اور خدا کرے میری یہ رائے غلط ہو) ایران کی اسلامی تحریک کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اسلامی جماعتیں جمہوریت کی ماہیت اور نوعیت سے کماحقہ واقف نہیں ہیں۔ وہ جمہوری عمل کو غیر اقداری تصور کرتی ہیں اور ان کی رائے میں جمہوری عمل کے ذریعہ اسلامی اقدار، اخلاقیات اور روحانیت کا فروغ ممکن ہے۔ اسی طرح وہ سرمایہ دارانہ ریاستی ہیئت اور اس ہیئت میں جمہوری عمل کے مقام کو بھی نہیں پہچانتیں۔ لہٰذا وہ جمہوری عمل کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظاماتی تناظر میں اسلامی حکومتیں قائم کرنے کی جدوجہد کرتی ہیں (کبھی کبھی اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں مثلاً اخوان 2012ء میں مصر میں یہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی) اس نوعیت کی جدوجہد جمہوری عمل کے ذریعہ سرمایہ دارانہ تحکم کا اسلامی جواز مرتب کرنے پر منتج ہوتی ہے۔

طالبان کی حکومت جمہوری عمل کو قبول کرنے پر مجبور نہیں وہ جمہوری عمل کے ذریعہ وجود میں

نہیں آئی۔اس نے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ ایک ملک فتح کیا ہے اور اس کی ماس بیس نہایت وسیع اور مضبوط ہے۔اس نے جس حد تک بھی عوامی تائید حاصل کی ہے وہ جمہوری اقدار کے فروغ کے ذریعہ نہیں اسلامی عصبیت کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ اگر طالبان حکومت نے جمہوری عمل کی تنفیذ کو روا رکھا تو وہ لامحالہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں ضم ہو جائے گی۔ طالبان ایک اسلامی حکومت تو قائم کر لیں گے لیکن امارت اسلامیہ کبھی ایک اسلامی ریاست نہ بن سکے گی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کی حقیقت کو پہچانا جائے۔

جمہوریت کیا ہے؟

دورِ حاضر کی جمہوریت خواہ لبرل، خواہ اشتراکی، خواہ قوم پرست، سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ جمہوری عمل سرمایہ دارانہ انفرادیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ جمہوری نظام میں ہر فرد اپنے سرمایہ دارانہ حقوق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار تصور کرتا ہے۔ چونکہ ان جمہوری عقائد کی علمیاتی بنیادیں اٹھارھویں صدی کی تحریکات تنویر اور رومانویت سے ماخوذ ہیں لہٰذا جمہوری معاشرت میں جو عقلیت فروغ پاتی ہے وہ نفس امارہ کے احکامات کی تابعداری کو فرض عین گردانتی ہے۔ اس عقلیت کو ریشنلٹی کہتے ہیں۔ ایک جمہوری ریاست اپنے سٹیزنز کی نفسانی خواہشات کے اتباع کی بنیاد پر ان سٹیزنز سے تائید اور وفاداری طلب کرتی ہے۔

سرمایہ دارانہ آزادیوں کی ضمانت جمہوری ریاست کا دستور دیتا ہے۔ جمہوری ریاست میں دستور کتاب اللہ کی جگہ لے لیتا ہے۔ دنیا کا ہر دستور ہیومن رائٹس کے تقدس کو تسلیم کرتا ہے اور ہیومن رائٹس تحکم قانون سرمایہ کی تنفیذ کا ذریعہ ہیں۔ چونکہ ہر جمہوری فرد اپنی آزادی اور خود مختاری کا ذمہ دار ہے لہٰذا ہر جمہوری فرد کا حق اور فرض ہے کہ وہ اپنی بدنی قوتیں، رائے اور املاک بڑھوتری سرمایہ کے لیے وقف کر دے کیونکہ بڑھوتری سرمایہ کے علاوہ آزادی کو فروغ دینے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

جمہوری معاشرت ایک ذلیل ترین اور خبیث ترین انفرادیت کو جنم دیتی ہے۔ ایک ایسی خودغرض انفرادیت جو حرص و ہوس، شہوت اور غضب سے مغلوب ہو اور جو اپنی زندگی کا مقصد دنیا میں لذات کے حصول کے علاوہ اور کسی چیز کو نہ سمجھے۔

آج سامراج کی یہ کوشش ہے کہ طالبان جمہوری عمل کی تنفیذ کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کر

لیں کیونکہ سامراج خوب جانتا ہے کہ یوں افغان معاشرت کی اسلامیت کو تحلیل کرنے کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے اور حکومت اسلامی کو تحکم قانون سرمایہ (یعنی عمومی عوامی نفس پرستی) کی اطاعت پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی ریاستی نظام

سامراج کے غلبہ سے قبل ہماری بارہ سو سالہ تاریخ میں خلافت عثمانیہ کے سقوط تک اسلامی حکومتیں قائم رہیں۔ کبھی بھی کسی بھی اسلامی ریاست نے کوئی دستور نہیں بنایا (جب امام عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے ریاستی معاملات کو شرع مطہرہ کے مطابق وضع کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ نے دستور سازی نہیں کی بلکہ علما کے فتاوٰی جمع کیے) اور نہ کسی قدیم سیاسی امام (امام ماوردیؒ، امام ابویعلیٰ، امام ابن خلدون رحمہم اللہ اجمعین) کے ہاں جمہوری طرزِ ریاست سازی کی کوئی توجیہ نہیں ملتی ہے۔ لہٰذا جمہوری عمل کی تنفیذ خلافِ اولیٰ ہے۔

لہٰذا طالبان کو جمہوری عمل کو فی الفور بالکلیہ رد کر دینا چاہیے اور

۱۔ دستور سازی کے عمل کو ترک کر دینا چاہیے

۲۔ ریاستی نظام میں نمایندگی کے اصول کے لیے کوئی گنجائش نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے

۳۔ معاشرہ کو جمہوری خطوط پر پر مرتب ہونے کی راہ میں ریاستی رکاوٹیں قائم ہونی چاہئیں۔

۴۔ عوام میں یہ احساس پیدا کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیے کہ اسلامی ریاستی نظام کی ہر سطح پر حکام رسول اللہ ﷺ کے طابع ہوتے ہیں عوام کے نمایندہ نہیں ہوتے۔

۵۔ سامراجی دباؤ میں آکر ہیومن رائٹس کی تنفیذ کو قبول نہیں کرنا چاہیے اور ریاستی فیصلوں کی بنیاد عوامی خواہشات کی تشکیل نہیں، نصوص صحیحہ کی اتباع پر مبنی ہونی چاہیے۔

۶۔ ہیومن رائٹس کی اسلام کاری کی تمام کوششوں کو رد کر دیا جائے کیونکہ یہ شیطانی دھوکہ اور سامراجی سازش ہیں۔ حقیقتاً ہیومن رائٹس حقوق العباد کی ضد ہیں۔

۷۔ نظام اقتدار کو وسعت دے کر اس کو مرکز سے علاقائی سطح تک پھیلانا چاہیے اور کوشش کرنا چاہیے کہ علما، صوفیاء اور طلبہ کی قیادت کے تحت زیادہ سے زیادہ عوام اس نظام اقتدار میں

شامل ہوں۔ اس نظام اقتدار میں ملک بھر میں کم از کم تین سے چار لاکھ افراد کو اقتداری ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ یہ نظام اقتدار سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر منظم کیا جائے۔

۸۔ سیاسی اور دعوتی حکمت عملی کو یوں مربوط کرنا چاہیے کہ عوام میں یہ احساس فروغ پاتا رہے کہ سیاسی عمل حصول رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے، اتباع احکام نفس امارہ کا ذریعہ نہیں ہے۔

۹۔ جمہوری عمل کی تنفیذ سامراجیوں کو افغانستان میں معاشرتی تخریب کاری کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس تخریب کاری کے دو ذرائع ہیں۔ اقوام متحدہ کے امدادی ادارے یونیسف، ڈبلیو ایچ او، یو این سی ایچ آر، یو این ایف پی جو صحت اور تعلیم کے شعبہ میں کارفرما ہیں اور وہ غیر سرکاری تنظیمیں (این جی اوز) جو سامراجی امداد کے سہارے چلتی رہی ہیں۔ ان تمام ایجنسیز کو فی الفور بند کر دینا چاہیے کیونکہ یہ عورتوں میں فحاشی اور عریانی پھیلانے کے ذرائع ہیں اور حکومت کو نظام ترسیل امداد کو قومیا لینا چاہیے۔ یعنی بیرونی ممالک سے جو بھی امداد حاصل ہو افغانستان میں اس کی تقسیم کا کام حکومتی تحویل میں ہو غیر ملکی ایجنسیوں کی تحویل میں نہ ہو۔ کل تک تمام یو این ایجنسیاں سامراج کی آلہ کار بنی رہیں آج وہ افغانستان کی زبوں حالی پر مگر مچھ کے آنسو بہا رہی ہیں وہ صرف سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے ہیں اقوام متحدہ کے تمام ادارے امریکا کے جاسوس ہیں۔

طالبان کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ سامراج کے خلاف ان کا جہاد اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ جمہوری عمل اور دستور سازی اس جہاد میں پسپائی کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ جمہوری عمل کی تنفیذ کے نتیجہ میں اسلامی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے اسلامی ریاستی نظام کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔

درخواستِ دُعا

البرہان کے نائب مدیر اور میرے دیرینہ رفیق پروفیسر ملک محمد حسین صاحب شدید علیل ہیں اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ قارئین سے اُن کی صحت کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ مدیر

تفہیم دین

ڈاکٹر محمد امین

تلاوتِ دین یا اقامتِ دین؟

دین کے ناقص تصور کا شاخسانہ

اس عنوان سے بہن عامرہ احسان کا ایک مضمون تنظیم اسلامی و جماعت اسلامی کے حلقوں میں کافی مقبول ہوا ہے اور ان کے کئی جرائد میں چھپا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہن عامرہ احسان کا قلم مغرب کی دجالی تہذیب کے خلاف اور اسلام کے حق میں مؤثر اسلوب کی ایک توانا آواز ہے اور ہم بھی ان کے کالم شوق سے پڑھتے ہیں۔ جو بات اس مضمون میں وہ کہنا چاہتیں تھیں وہ بھی اصولاً صحیح ہے کہ اسلام میں مطلوب ایمان اور عمل صالح دونوں ہیں۔ ایمان بلا عمل قابل اصلاح بھی ہے اور قابل مذمت بھی۔ یہ منافقت ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں ناکامی اور رسوائی کا سبب ہے اور قرآن حکیم نے اس کی سزا اسفل السافلین قرار دی ہے۔ لیکن اس مضمون کے لیے جن الفاظ کا انتخاب ہماری بہن نے کیا ہے اور جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ یقیناً غیر مناسب ہے اور وہ نتیجہ ہے اس ناقص اور غیر متوازن تصور دین کا جو جدید دینی تحریکوں نے 'اقامت دین' کے عنوان سے اختیار کر رکھا ہے۔ ناقص کا مطلب ہے جزوی، نامکمل۔

یہ کہنا کہ دین میں اصل مطلوب 'اقامت دین' ہے نہ کہ 'تلاوتِ دین' ایک ناقص اور غیر مناسب بیانیہ ہے۔ نقل کی رو سے بھی اور عقل کی رو سے بھی، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

نقلی دلائل

اوّل تو لفظ تلاوت ہماری دینی روایت میں قرآن حکیم کے لیے مخصوص ہے۔ قرآن حکیم میں بھی 'تلاوت' کا لفظ کتب سماویہ کے پڑھنے کے لیے استعمال ہوا ہے جبکہ عام کتابوں کے پڑھنے کے لیے لفظ 'قرأت' استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا 'تلاوتِ دین' ایک غیر متعلق عبارت یا فریز (Phrase) ہے جبکہ صحیح عبارت 'تلاوت قرآن' ہے۔ دینی کتب پڑھنے کو تلاوت نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ عربی جانتے ہیں وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ 'تلاوت' میں صرف پڑھنا نہیں بلکہ پڑھنے کے ساتھ اس میں پڑھے ہوئے پر غور و فکر کرنا اور اس کی پیروی کرنے کا مفہوم بھی

شامل ہوتا ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے امام راغب اصفہانی کی 'مفردات القرآن' بذیل مادہ ت ل و۔اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ دیکھیے طبع اسلامی اکادمی لاہور) گویا 'تلاوت' کے عربی لفظ میں یہ مفہوم موجود ہے کہ اللہ کی کتاب پڑھی جائے اور اس کی پیروی کی جائے، اس پر عمل کیا جائے جبکہ سادہ 'قرأت' میں صرف پڑھنے کا مفہوم ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس دنیا میں آج تک جتنی بھی تعمیری اور صحت مند تبدیلی آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مبعوث کردہ انبیاء ورسل کے ذریعے آئی ہے جن کا طریق کار اور منہج قرآن حکیم نے دعوت وتزکیہ کو قرار دیا ہے[۱] جس میں منزّل من اللہ کتاب کی تلاوت اور تعلیم سرفہرست تھی جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے گزارش کی کہ:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾[البقرہ۲:۱۲۹]

''اور ہمارے پروردگار! ان میں ایک ایسا رسول بھی بھیجنا جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اوران کا تزکیہ کرے۔ بیشک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل ہے۔''

نبی کریم ﷺ جو اس دنیا میں سب سے بڑا انقلاب لائے تھے، اس کا طریق کار اور منہج بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تین دفعہ بتایا[۲] کہ چار نکات پر مبنی تھا: ۱۔تلاوت آیات ۲۔تعلیم کتاب (قرآن حکیم) ۳۔تعلیم حکمت اور ۴۔تزکیۂ نفس

چوتھے یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا ہے کہ کثرت تلاوت اور کثرت ذکر مطلوب ہے۔ مضمون کو مختصر رکھنے کی خاطر دونوں موضوعات پر صرف ایک ایک آیت اور حدیث پیش خدمت ہے:

تلاوتِ آیات

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ

[۱] نوح ۷۱:۵-۱۳، النازعات ۷۹:۱۷-۱۹، الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۹،

[۲] البقرہ ۲:۱۵۱، آل عمران ۳:۱۶۴، الجمعہ ۶۲:۲

اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴿۲﴾ [الانفال ۸:۲]

''مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو،....وَاقْرَإِ القُرْآنَ فِي كُلِّ شَهْرٍ قَالَ: قُلْتُ: أُطِيقُ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ....فقال وَاقْرَأْ فِي كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً. ... قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: " وَقَالَ بَعْضُهُمْ: فِي ثَلاَثٍ وَفِي خَمْسٍ وَأَكْثَرُهُمْ عَلَى سَبْعٍ. ①

امام بخاریؒ نے ایک طویل حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ وہ کتنے روزے رکھیں اور کتنا قرآن پڑھیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مہینے میں ایک دفعہ قرآن ختم کیا کرو۔ انہوں نے کہا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ سات دن میں ختم کر لیا کرو....امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ کہتے ہیں تین دن میں قرآن ختم کیا کرو، بعض کہتے ہیں پانچ دن میں، تاہم اکثر کا کہنا ہے کہ سات دن میں ختم کرنا چاہیے۔

صحابہ تلاوتِ قرآن کا اتنا شوق رکھتے تھے اور اتنی کثرت سے پڑھتے تھے کہ تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم کر لیتے تھے۔ اس پر نبی کریم ﷺ کو ٹوکنا پڑا کہ تین دن سے پہلے ختم نہ کیا کرو۔ فرمایا:

"لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ القُرْآنَ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلاَثٍ". ②

جس نے قرآن تین دن سے کم میں ختم کیا اُس نے اسے سمجھنے کا حق ادا نہیں کیا۔

کثرتِ ذکر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴿۴۱﴾ [الاحزاب ۳۳:۴۱]

---

① صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۵۲

② جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۹۴۹

''اے ایمان والو! اللہ کو خوب کثرت سے یاد کیا کرو۔''

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ وَأَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ رضی الله عنهما : أَنَّهُمَا شَهِدَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ : لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللهَ عزوجل إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ۔(۱)

''حضرت ابو ہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ دونوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں گواہی دی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب بھی لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بیٹھتے ہیں انہیں فرشتے ڈھانپ لیتے ہیں، رحمت انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، ان پر سکینت (سکون و طمانیت) کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنی بارگاہ کے حاضرین میں کرتا ہے۔''

خلاصہ یہ کہ تلاوت کتاب کو محض Lip Service سمجھ کر تحقیر کے انداز میں اس کا ذکر کرنا اور یہ قرار دینا کہ یہ دین میں مطلوب نہیں ایک غلط اپروچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تلاوت کتاب کی ایک شرعی حیثیت ہے۔ یہ دین میں مطلوب ہے اور دین کی اقامت یعنی دین پر عمل کرنے کا بنیادی ذریعہ ہے۔

عقلی دلائل

۱۔ مسلمان ماہرین علم النفس (جیسے امام غزالی وابن سینا وغیرہ) اور جدید ماہرین نفسیات سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی عمل نتیجہ ہوتا ہے ایک فکری پراسیس کا۔ یعنی انسان کے دل (ودماغ) میں ایک خیال/حدس پیدا ہوتا ہے۔ اس کا تسلسل اور بقا اسے ایک عقیدے/پختہ نظریے میں تبدیل کرتا ہے۔ اس پختگی سے کسی کام کی 'نیت' پیدا ہوتی ہے۔ نیت کی پختگی 'ارادے' میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ارادے کی پختگی 'عزم' کو جنم دیتی ہے۔ عزم کی پختگی قویٰ کو حرکت میں لاتی ہے اور عمل وجود میں آتا ہے۔ عمل کا تکرار 'عادت' کو جنم دیتا ہے اور عادات کے تکرار سے مخصوص انسانی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسانی عمل کا انحصار اس نظریے کی پختگی پر ہوتا ہے جس میں وہ یقین رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی روایت میں 'اعمال صالحہ' نتیجہ ہوتے ہیں 'ایمان' کی پختگی کا اور ایمان کی پختگی کا ذریعہ ہے کثرتِ تلاوت اور کثرتِ ذکر۔ اس

---

(۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۰۷۴

سے ظاہر ہے کہ کثرتِ تلاوت حکم شرعی تو ہے ہی اس کا عقلاً مفید ہونا بھی ظاہر وباہر ہے۔

۲۔ انسانی اعمال پر جو چیز فوری اثر کرتی ہے وہ 'لفظ' ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے اور گہری نفسیاتی حقیقت بھی۔ ایک آدمی دوسرے کو کہے' آپ کے ابا جان کیسے ہیں؟ تو اس کا ایک خوشگوار اثر ہوگا۔ اور اگر وہی آدمی دوسرے کو کہے' تمہاری ماں کے خصم کا کیا حال ہے؟ تو ظاہر ہے اس کا تاثر دوسرا ہوگا۔ اگر کسی دفتر میں سارے ساتھی مل کر فیصلہ کرلیں کہ سب نے سارا دن ایک مخصوص آدمی کو کہنا ہے کہ ''تم پاگل ہو'' تو تصور کیجیے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ آدمی سر کے بال نوچنے لگے گا، سچ مچ پاگل ہوجائے گا یا دفتر چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ ہم سب کا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ صحیح اور مؤثر لفظوں کا انتخاب کسی شاعر اور ادیب کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے اور لفظوں کا نامناسب انتخاب بعض اوقات رسوائی کا سبب بن جاتا ہے۔ راقم البرہان میں اپنی نوجوانی کا وہ واقعہ ذکر کر چکا ہے جب اس کا قادیانیوں سے واسطہ پڑا اور وہ دین کا علم نہیں رکھتا تھا تو اس نے مرزا صاحب کو اس لیے نبی ماننے سے انکار کردیا کہ ''جس شخص کی زبان اتنی گندی ہو وہ نبی نہیں ہوسکتا''۔

لفظ کی اہمیت کی یہ حقیقت کہ وہ عمل پر فوری اور براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ پیش نظر رکھیے اور اس پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں بار بار کثرتِ ذکر کا حکم کیوں دیتا ہے؟ اللہ ورسول کثرت تلاوت کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ اور صحابہ کرام، تابعین اور اسلاف کثرت تلاوت کو معمول کیوں بناتے تھے؟ اس لیے کہ یہ معمول اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے، یہ اعمال صالحہ کو جنم دیتا ہے۔ سارے مسلمان نماز پڑھتے ہیں لیکن ہم نماز کی ہیئت پر کم ہی غور کرتے ہیں۔ جب مؤذن آپ کو نماز کے لیے بلاتا ہے تو کہتا ہے اللہ اکبر، اللہ اکبر (چھ دفعہ) جب نماز کھڑی ہونے لگتی ہے تو تکبیر تحریمہ پڑھی جاتی ہے۔ تکبیر پڑھنے والا پھر بار بار دہراتا ہے اللہ اکبر، اللہ اکبر، (چھ دفعہ)۔ پھر جب آپ نماز شروع کرنے لگتے ہیں تو اللہ اکبر کہہ کر اللہ کے حضور ادب سے ہاتھ باندھ لیتے ہیں۔ پھر جب رکوع میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ اکبر۔ جب سجدے میں جاتے ہیں تو کہتے اللہ اکبر۔ جب سجدے سے سر اٹھاتے ہیں تو کہتے ہیں اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کی یہ بار بار تکرار (جو واجب ہے، حکم شرعی ہے) کیا بے سود ہے؟ بے فائدہ ہے؟ بے اثر ہے؟ ہرگز نہیں جب آپ بار بار اللہ کی کبریائی کا اعلان کررہے ہوتے ہیں تو گویا آپ یہ اقرار کررہے ہوتے ہیں کہ اے اللہ!

آپ ہی عبادت کے مستحق ہیں، آپ ہی اطاعت کے مستحق ہیں۔ مَیں آپ کا حقیر عبد ہوں، مَیں آپ ہی کی عبادت کروں گا، مَیں آپ ہی کی اطاعت کروں گا۔ تو کیا لفظوں کی یہ تکرار آپ کے اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی؟ لہٰذا یہ کہنا کہ تلاوت بے کار اور کثرت ذکر بے سود ہے، بے عقلی کی بات ہے۔ یہ عقلاً بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ تلاوتِ آیات مؤثر ذریعہ ہے اقامتِ دین کا یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین پر عمل کا لہٰذا یہ سوال اٹھانا ہی غلط ہے کہ تلاوتِ دین یا اقامت دین؟ [یہ مباحث جن کا ہم نے چند سطور میں ذکر کیا ہے، بڑی تفصیل سے ہماری کتاب 'اسلام اور تزکیۂ نفس' میں زیر بحث آئے ہیں جو تھیسز ہے ہماری دوسری ڈاکٹریٹ کا۔ اگر کوئی اس موضوع کا تفصیلی علمی مطالعہ کرنا چاہے تو اس کتاب سے رجوع کرے]۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500 روپے پانچ سال: 2000 روپے تاحیات: 10,000 روپے

نام............................ پتہ............................

............................فون............................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تفہیم دین

پروفیسر ایم اے رفرف[۱]

کیا ہم پاکستانی واقعی غریب ہیں؟

یا ہم نے مغرب کی الحادی تہذیب کی ابھاری ہوئی دنیاوی خواہشات کے پورا نہ ہونے کو غربت قرار دے رکھا ہے

ایک آدمی سے کسی نے پوچھا کہ آج کل اتنی غربت کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا' میرے خیال میں آج اتنی غربت نہیں جتنا اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

آج کل ہم جسے غربت کہتے ہیں وہ دراصل مغربی تہذیب کی پیدا کردہ خواہشات کا پورا نہ ہونا ہے۔

ہم نے تو غربت کے وہ دن بھی دیکھے ہیں کہ اسکول میں تختی پر (گاچی) کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو (مٹی) لگایا کرتے تھے۔

سلیٹ پر لکھنے کے لیے سلیٹی کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو بجری کا کنکر استعمال کرتے تھے۔

سکول کے لیے جو کپڑے خریدتے تھے وہی عید پر بھی پہن لیتے تھے۔

اگر کسی شادی بیاہ کے لیے کپڑے لیتے تھے تو اسکول کلر کے ہی لیتے تھے۔

کپڑے اگر پھٹ جاتے تو سلائی کر کے بار بار پہنتے تھے۔

جوتا بھی اگر پھٹ جاتا تو بار بار سلائی کرواتے تھے۔

اور جوتا سروس یا باٹا کا نہیں پلاسٹک کا ہوتا تھا۔

گھر میں اگر مہمان آجاتا تو پڑوس کے گھروں میں سے کسی سے گھی، کسی سے مرچ، کسی سے نمک مانگ کر لاتے تھے۔

آج تو ماشاء اللہ ہر گھر میں ایک ایک ماہ کا سامان پڑا ہوتا ہے۔

---

[۱] موٹیویشنل سپیکر، ٹرینر، دانشور، COO (اعزازی) تدریس القرآن پراجیکٹ، جنرل مینجر سیلز آدم جی انشورنس

مہمان تو کیا پوری بارات کا سامان موجود ہوتا ہے۔

آج تو سکول کے بچوں کے دو یا تین یونیفارم ضرور ہوتے ہیں۔

آج اگر کسی کی شادی پہ جانا ہو تو مہندی، بارات اور ولیمے کے لیے الگ الگ کپڑے اور جوتے خریدے جاتے ہیں۔

ہمارے دور میں ایک چلتے پھرتے انسان کا لباس تین سو تک کا اور بوٹ دو سو تک کا ہوتا تھا اور جیب خالی ہوتی تھی۔

آج کا چلتا پھرتا نوجوان جو غربت کا رونا رو رہا ہوتا ہے اُس کی جیب میں تیس ہزار کا موبائل، کپڑے کم سے کم دو ہزار کے اور جوتا کم سے کم تین ہزار کا ہوتا ہے۔

غربت کے دن تو وہ تھے جب گھر میں بتی جلانے کے لیے تیل نہیں ہوتا تھا تو روئی کو سرسوں کے تیل میں ڈبو کر جلا لیتے۔

آج کے دور میں خواہشوں کے پورا نہ ہونے کی غربت ہے۔

اگر کسی کی شادی میں شامل ہونے کے لیے تین جوڑے کپڑے یا عید کے لیے تین جوڑے کپڑے نہ سلا سکے تو وہ سمجھتا ہے میں غریب ہوں۔

ہم ناشکرے ہو گئے ہیں، اسی لیے برکتیں اٹھ گئی ہیں۔

سچ بات یہ ہے کہ پہلے درجہ بندی کم تھی۔ معاشرتی اسٹیٹس کم و بیش ایک جیسا تھا، توکل بہت تھا، باہمی ہمدردی زیادہ تھی، مل جل کر رہنا اچھا سمجھتے تھے جبکہ آج کل تنہائی پسندی ہے، علم زیادہ ہے عمل کم۔

اِس دور میں اللہ کی نعمتیں بدرجہا زیادہ ہیں لیکن اکثر شکر، توکل اور باہمی تعلقات کمزور ہیں۔

اللہ کریم ہم سب کو کامل ہدایت بخشیں اور دین اسلام کو سمجھنے اور سیکھنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)۔

تفہیم مغرب ڈاکٹر محمد امین

مغربی تہذیب دینِ کفر اور دینِ غیر اللہ ہے (تیسری قسط)

مسلمانوں پر اس کا رد واجب اور اس کی پیروی حرام ہے

برٹرینڈ رسل نے اٹھارویں صدی کے مادی نقطۂ نظر کا خلاصہ تین نکات کی صورت میں پیش کیا ہے:[1]

۱۔ حقائق مشاہدے پر مبنی ہونے چاہئیں نہ کہ ایسی سند پر جو عقیدے کے تحکم پر مبنی ہو۔

۲۔ مادی دنیا ایک ایسا نظام ہے جو خود کار ہے اور جس میں تمام تغیرات طبیعی قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔

۳۔ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مقصد و معنی ہے۔

انیسویں صدی میں ہیگل اور ڈارون نے مادی نقطۂ نگاہ کو مزید آگے بڑھایا۔ ہیگل نے کہا نیچر وہ ہے جس کا ادراک ہم حواس خمسہ سے کرتے ہیں نیز اس نے شعور وذہن کی تشریح عضویاتی پہلو سے کی۔ ڈارون نے حیاتیات کے مطالعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان حیوان ہی سے ارتقاء پذیر ہوا ہے۔ سپنسر نے کہا کہ انسان سمیت سب ذی حیات پر طبیعی قوانین کا اطلاق ہونا چاہیے۔

بیسویں صدی میں اگرچہ مادہ بحیثیت ایک شے کے غائب ہو گیا جب شراڈنگر، پلانک اور ہائزن برگ نے نظریۂ مقادیر عنصری پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آئن سٹائن کی تحقیقات اور نظریۂ اضافت نے ثابت کر دیا کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے۔ اس طرح زمان ومکان کے قدیم تصورات تحلیل ہو گئے لیکن بایں ہمہ مادہ پرستی کی روح (جس کا خلاصہ خدا کی خدائی کی نفی اور اس کی جگہ فطرت کو فعال ماننا، وحی کی برتری کا بطلان اور حسی علم کو اس کی جگہ دینا، حیوانات کے قوانین کا اطلاق انسان پر کرنا اور آخرت کے مقابلے میں دنیا اور مظاہر دنیا کو ترجیح دینا وغیرہ) مغرب کے فکر و عمل میں ہر سو جاری ہے۔

ظاہر ہے مغربی فکر وتہذیب کی یہ مادہ پرستی خلاف اسلام ہے۔ اسلام انسان کے مادی وجود

[1] B. Russell, History of Western Philosophy, P-387

اور اس کی احتیاجات اور مقتضیات کی نفی نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی اسے ایک اخلاقی وجود قرار دیتا ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں مثلاً قرآن حکیم نے صرف سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے (۱) اور مریض و مسافر کو استثنیٰ دیا (۲)۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مسلسل روزے رکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا (۳) اور فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (۴)۔ چنانچہ اسلام نفس کشی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ تہذیب نفس کا قائل ہے اسی لیے بعض صحابہ نے خصی ہونے کی اجازت مانگی (۵) تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ حضرت عثمان بن مظعون ؓ اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ بھی مشہور ہے جس میں انہوں نے حضرت عائشہ ؓ سے آپ ﷺ کے عبادت کے معمولات پوچھے تو انہوں نے انہیں کم سمجھا کہ آپ تو معصوم عن الخطا تھے اور پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ ساری رات عبادت کیا کرے گا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کرے گا اور تیسرے نے کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ حضرت عائشہ ؓ نے یہ باتیں سنیں اور آپ (ﷺ) کے گھر لوٹنے پر انہیں بتائیں تو آپ ﷺ کو یہ پسند نہ آئیں اور آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور ان تینوں اصحاب کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں اور میں نے شادیاں بھی کر رکھی ہیں (۶)۔ خلاصہ یہ کہ اسلام ایک توازن کے ساتھ انسان کے مادی اور اخلاقی وجود دونوں کے مطالبات پورے کرتا ہے۔

کیپٹل ازم (Capitalism)

کیپٹل ازم یعنی مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی تین سطحیں یا حیثیتیں ہیں: ایک تو یہ کہ وہ ایک معاشی نظام ہے۔ معاشی نظام ہونے کی حیثیت میں بھی وہ غیر اسلامی ہے

---

(۱) البقرہ ۲: ۱۸۳

(۲) البقرہ ۲: ۱۸۴

(۳) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۶۳

(۴) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۱۹۶۸

(۵) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۷۱

(۶) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۶۳

اور غیر عقلی وغیر فطری ہے یعنی خلافِ فطرت انسانی ہے۔کیپٹل ازم کو غیر اسلامی اور غیر فطری وغیر عقلی ثابت کرنا خود ایک بڑا علمی موضوع اور تحقیقی پراجیکٹ ہے۔اس پر کافی کام ہو چکا لیکن ابھی اس پر مزید علمی کام کی ضرورت ہے.... بلکہ یہی کام ساری مغربی آئیڈیالوجی، افکار ونظریات، ورلڈ ویو اور اداروں (جیسے نیشن سٹیٹ، ڈیموکریسی وغیرہ) کے بارے میں کیا جانا چاہیے؛ تاہم ظاہر ہے یہاں محض اس کام کی نشان دہی ہی کی جا سکتی ہے۔

کیپٹل ازم کی بطور ایک معاشی نظام تین اہم خصوصیات ہیں: ایک یہ کہ وہ انسان اور محنت کے مقابلے میں سرمائے کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔دوسرے یہ کہ اسی بناء پر وہ سود (ربا) کو جائز ٹھہراتا اور استعمال کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ مادر پدر آزادی چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ ریاست کی ریگولیٹری/ مانیٹرنگ اتھارٹی کو بھی تسلیم نہیں کرتا اور فری مارکیٹ اکانومی کا تصور دیتا ہے۔ معیشت کے یہ تینوں بنیادی اصول اسلام کی اقتصادی تعلیمات اور معاشی نظام کے خلاف بلکہ ان سے متضاد ہیں کیونکہ اسلام مغرب کی سرمایہ پر مبنی اور اشتراکیت کی محنت پر مبنی انتہا پسندی کے خلاف انسان اور اس کی متوازن اور مبنی بر عدل اجتماعی فلاح کا علمبردار ہے اور اس پر ترکیز کرتے ہوئے سرمائے اور محنت کے متوازن کردار کو اپناتا ہے۔اسی طرح اسلام سود کی شدید مخالفت کرتا ہے بلکہ اسے اللہ ورسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیتا ہے۔[1] اور یہ وہ واحد حکم ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایسے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ربا کا لازمی نتیجہ ارتکاز دولت ہے اور اس کے نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں کہ اس سرمایہ دارانہ سودی نظام کی وجہ سے امریکہ ویورپ میں دولت کا ارتکاز ہو گیا ہے اور ایشیا وافریقہ کے اکثر ممالک، خصوصاً عالم اسلام، بھوک اور ننگ کا شکار ہے، جبکہ اسلام تقسیم دولت کی تعلیم دیتا ہے[2] تاکہ معاشرے میں اقتصادی توازن برقرار رہے۔

اسی طرح اسلام سرمایہ کے کردار پر ریاست وحکومت کی نگرانی کا اصول تسلیم کرتا ہے کیونکہ اگر اسلامی ریاست سرمائے کے کردار کو کنٹرول نہ کرے تو سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ منافع کے لالچ میں حرص وہوس اور استحصال کی ہر حد کو پار کر لیتا ہے۔

---

[1] البقرہ۲:۲۸۹

[2] الحشر ۵۹:۷

نظام سرمایہ داری کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ محض معاشی نظام نہیں بلکہ دین ومذہب واخلاق کے مقابلے میں مادہ پرستی (میٹریل ازم) پر مبنی مکمل دین اور نظامِ حیات ہے۔ یہ دنیا، دولت اور معاشی ترقی (یعنی دنیا میں زیادہ سے زیادہ آسائشوں اور راحتوں کو یقینی بنانا) کو بنیاد بناتا ہے اور اخروی زندگی اور اس کی کامیابی اور دنیا پر اس کی ترجیح کے اسلامی اصول کو رد کرتا ہے۔ یہ انسان کو ''عبدالدرھم والدینار'' بنا دیتا ہے اور اسے حرص وہوس وحسد کے جال میں جکڑ لیتا ہے جس کی مذمت ہادی برحق (ﷺ) نے علی الاعلان فرمائی ہے۔[1] اور آخرت کی ترجیح والی زندگی عملاً گزار کر دکھائی ہے کہ وہ کتنی سادہ، توکل، قناعت اور زہد پر مبنی ہوتی ہے جس کا ہدف آخرت کی کامیابی اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے نہ کہ محض دنیا کی ترقی اور اس میں آسائشوں اور راحتوں کا حصول، راتوں رات امیر بننے کی خواہش، حلال وحرام کی عدم تمیز، معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ (یعنی ہر قیمت پر کار، کوٹھی اور بنک بیلنس کا حصول)، کرپشن، رشوت، چوری، ڈاکے، فراڈ اور بد دیانتی.... مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کے مظاہر ہیں۔

کیپٹل ازم کے جس کردار کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے اس کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مغرب کا نظام سرمایہ داری نہ صرف خلاف اسلام ہے اور اس کی تعلیمات اور اصولوں سے متضاد ہے بلکہ وہ دین اللہ کے مقابلے میں طاغوت اور اسلامی طرز زندگی کے مقابلے میں کفر وجاہلیت پر مبنی نظام حیات ہے کہ مسلمان مادہ پرست (Materialist) ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر مغرب کا نظام سرمایہ داری کفر ہی نہیں کفر گر بھی ہے۔ (جیسے بادشاہ کے مقابلے میں بادشاہ گر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کفر اس کے بعد وجود میں آنے والے مغربی افکار ونظریات اور اداروں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ جمہوریت بظاہر ایک سیاسی نظام ہے لیکن یہ صرف جمہوریت نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے یعنی جمہوریت کے سیاسی نظام میں سرمایہ دارانہ روح غالب اور فعال ہے۔ جمہوری انتخابات میں وہی فرد اور جماعت جیت سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ سرمایہ خرچ کر سکتی ہو چنانچہ پارلیمنٹ ہو یا اس کے ذریعے بننے والی حکومت، اس میں سرمایہ دار ہی غالب ہوتے ہیں اسی طرح مغرب کا ایک معاشرتی نظام ہے لیکن یہ بھی 'سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام' ہے کیونکہ اس معاشرے کے خدوخال سرمایہ ہی طے کرتا ہے (مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کام کریں، بچے ڈے کیئر سنٹرز میں پلیں، مائیں بچوں کو دودھ نہ پلائیں، والدین اور بچوں میں رابطہ اور محبت کی کمی، بچہ

---

[1] جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۷۵

بالغ ہونے پر والدین کی ذمہ داری نہیں۔ بوڑھے اولڈ ایج ہومز میں جائیں، اولاد کا والدین کی خدمت کرنے کا عدم تصور۔ حرامی بچوں اور طلاقوں کی کثرت.....وغیرہ) غرض پوری معاشرتی زندگی پر نظام سرمایہ داری کی گہری چھاپ ہے۔ غرض یہ سمجھنے میں دقت پیش نہیں آنی چاہیے کہ کیپٹل ازم محض ایک معاشی نظام نہیں بلکہ کفر پر مبنی نظامِ حیات ہے۔

تجربیت (Empiricism)

مغرب کا تصورِ علم یا فلسفۂ علم (Epistemology) یہ ہے کہ علم کا منبع عقل اور تجربہ و مشاہدہ ہے۔ ظاہر ہے جب ہیومنزم کی رو سے خدا کا انکار لازمی ٹھہرا اور اُس کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا ڈنکا بجایا گیا تو اب علم کا منبع بھی انسان اور اُس کی عقل ہی ٹھہری اور عقل بھی وہ جسے تجربہ اور مشاہدہ کا تڑکا لگایا گیا ہو۔ اب چونکہ نہ خدا نظر آتا ہے، نہ فرشتے اور نہ آخرت لہٰذا نہ صرف اُن کا وجود مشکوک ٹھہرا بلکہ خدا کی طرف سے ملنے والی ہدایت بھی نا قابل توجہ ٹھہری۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مغرب مذہبی علم اور عقائد کو ڈاگما (Dogma) یعنی الٰہی تحکم پر مبنی آراء اور توہمات سمجھ کر رد کر دیتے ہیں اور حقیقی و حتمی علم کا منبع انسانی عقل اور تجربہ و مشاہدہ کو قرار دیتے ہیں جن سے حاصل ہونے والا علم قابلِ تصدیق (Verifiable) ہوتا ہے۔

گویا تجربیت سے مراد ہے وحی اور عقل سے حاصل ہونے والے علم کے مقابلے میں حسیات سے حاصل ہونے والے علم کو یقینی اور قابلِ عمل ماننا۔ یہ تقابل شروع ہی سے فکرِ انسانی میں موجود رہا ہے۔ وحی کی برتری کو ماننے والے اہلِ مذاہب ہیں، عقل کو منبع علم سمجھنے والے اکثر فلسفی ہیں جب کہ سائنس دان (اور سائنسی منہج پر مبنی دیگر علوم کے ماہرین) حسّی علم کو حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ یونانِ قدیم کے سوفسطائی حسیات کو علمِ انسانی کا ماخذ سمجھتے تھے جب کہ افلاطون اور اس کے ہم خیال یہ سمجھتے تھے کہ عقل بذاتِ خود، حسّی تجربے اور مشاہدے کی تصدیق کے بغیر، صداقت کے انکشاف پر قادر ہے۔ رومیوں اور قرونِ مظلمہ سے گزر کر جب یہ علمی روایت احیائے علوم اور نشاۃِ ثانیہ کے دور میں داخل ہوئی تو کائنات کی حقیقت سے متعلق دو نظریے وجود میں آئے: ایک وہ جو افلاطون اور ارسطو کی روایت کی یادگار تھا اور جس کی رو سے امثال حقیقی ہیں اور دوسرا وہ جس کی رو سے کائنات کی حقیقی اشیاء خاص وہ اشیاء ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ پہلی روایت سے (عیسائی) مذہب نے اپنی تصدیق کا کام لیا اور دوسری روایت نے جدید سائنس کی بنیادیں

استوار کیں۔ سائنس میں گلیلیو اور فلسفے میں فرانسس بیکن ان رجحانات کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

بیکن کے نزدیک علم کا ماخذ حِسیات ہیں اور علم صرف انسانی تجربے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس نے فلسفے کو مذہب سے جدا کر کے علم کلام کو بے مصرف اور بے ثمر رجحان قرار دیا۔ تھامس ہوبز نے بھی حسیات ہی کو علم کا ماخذ قرار دیا اور سائنس اور فلسفے کو مذہب (علم کلام) سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ نیوٹن کی طرح جان لاک بھی تجربے اور مشاہدے سے علمی نتائج اخذ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ازلی وابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور حس ہی ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ اس نے ضمیر کے وجود کا بھی انکار کیا اور کہا کہ اخلاقی قوانین جبلی نہیں ہوتے بلکہ حسیات کے واسطے سے حاصل کیے ہوئے علم کی روشنی میں ہم جو رائے (صحیح یا غلط) قائم کرتے ہیں وہی ضمیر ہے۔ سیاست میں وہ عوام کی حاکمیت کے نظریے کے علمبردار تھا۔[1] ہیوم نے جو اٹھاویں صدی کی تشکیک کا امام تھا، لاک کے فلسفۂ تجربیت کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ اس نے کہا کہ انسانی تجربہ ہی انسانی علم کا ماخذ ہے اور صرف انہی اشیاء کا وجود ہے جن کا ادراک کیا جا سکے۔ اس بناء پر اس نے نفس انسانی، روح اور خدا کا انکار کر دیا کیونکہ یہ تصورات قابل ادراک نہیں ہیں۔[2] انیسویں صدی میں کومتے، بنتھم اور ولیم جیمز نے ہیوم کے اثرات قبول کیے۔

کومتے کو ایجابیت (Positivism) کا بانی کہا جاتا ہے جو تجربیت ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کے نزدیک کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین انسانی مشاہدے اور تجربے ہی کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اس اساس پر وہ انسان کو مرکز کائنات سمجھتا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا اور کسی وجود مطلق کو ماننا انسانی تجربے سے متجاوز ہے لہٰذا اس کے نزدیک ایک ہی وجود مطلق ہے اور وہ ہے انسانیت عالیہ لہٰذا صرف انسان کی فلاح و بہبود کی کوشش ہی نیکی ہے۔ اسی طرح کومتے کے نزدیک انسانی ذہن تین مراحل سے گزرا ہے مذہب، مابعد الطبیعیات اور مرحلۂ موجودہ یعنی ایجابیت یا سائنس۔ اس کے نزدیک مذہب اور مابعد الطبیعیات قصۂ پارینہ بن چکے ہیں اور اب سائنس کی خدائی کا دور ہے۔[3]

امریکہ کے نتائجیت پسند فلاسفہ ولیم جیمز اور ڈیوی اور دوسرے دور کے تجربیت پسندوں میں

---

[1] John Locke, An Essay Concerning Human Understanding, P-275ff

[2] David, Hume, An Enquiry Concering th Principlco of Morals, P-289

[3] E.A. Esper, A History of Psychology, P-212

سے جان اسٹوارٹ مل اور بنتھم کومتے کے افکار سے متاثر ہیں۔اسی طرح درخائیم، لیوی بروہل، تین اور رینان نے کومتے کے عمرانی نظریات کو بیسویں صدی میں نیا آہنگ دیا ہے۔

جان سٹوارٹ مل بھی جرمی بنتھم کی طرح افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے اور اس کی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ صرف لذت کی خواہش کی جاتی ہے اس لیے لذت ہی مستحسن ہے جب کہ بنتھم تو یہاں تک کہتا ہے کہ لذت ہی خیر ہے اور اذیت ہی شر ہے اور افادیت ہی ہر شے کا معیار ہے۔

امریکی نتائجیت پسندی (Pragmatism) کا شارح ولیم جیمز ہے جو لاک، ہیوم، کانٹ، پیرز اور کومتے کے افکار کا جامع تھا۔ ولیم جیمز کسی صداقت مطلقہ کا قائل نہیں تھا اور وجود مطلق (اللہ تعالیٰ) کو ''مابعد الطبیعی عفریت'' کا نام دیتا تھا۔ اس کے خیال میں صرف وہی اشیاء موضوع بحث بن سکتی ہیں جو انسانی تجربے سے لی گئی ہوں۔ انسانی تجربہ ہی حقیقت ہے اور صرف انسانی مشاہدہ اور تجربہ ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ اس کے نزدیک نتائجیت پسندی ایک طرزِ فکر ہے جس کا مقصد کسی نوع کی ازلی صداقتوں کا کھوج لگانا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات سے انسانی تجربے یا طرز عمل میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آیا وجود مطلق ہے یا نہیں؟ جیمز کی افادیت اور نتائجیت پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ مذہب کو بھی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان کا جوہر نہ جذبہ ہے نہ عقل بلکہ ایمان لانے کا ارادہ ہے جسے سائنسی طریقوں سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب میں کسی صداقت مطلقہ کا کھوج نہیں لگایا جاسکتا البتہ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ اللہ، حیات بعد الموت اور قدر و اختیار پر عقیدہ رکھنے سے ہمیں کوئی عملی (دنیاوی) فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو ان عقائد کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ [1]

نتائجیت پسندی کا ایک اور مشہور شارح جان ڈیوی ہے جو جیمز ہی کی طرح فکر انسانی کو محض ایک آلہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک کسی نظریے کی عملی کامیابی کی طرف رہنمائی ہی اس کی صداقت کا واحد معیار ہے۔ انگلستان کے پروفیسر شار نے نتائجیت پسندی کو انسان پسندی سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک جو کچھ بھی انسان کے لیے صحیح ہے اسے کسی مافوق الفطرت ہستی کی بجائے

[1] L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-98

انسانی مفاد ہی کی پرورش کرنی چاہیے۔ گویا خدا کو بھی صرف اس لیے مانو کہ اس سے دنیوی فائدہ ہوتا ہے ظاہر ہے اس سے بڑھ کر سیکولرزم اور لادینیت کا تصور کیا ہوسکتا ہے کہ عملی کامیابی، نتیجہ خیزی اور افادیت کو افکار کی صداقت کا معیار قرار دیا جائے بلکہ یہ تو محض کاروباری ذہنیت کی عکاسی ہے۔

تجربیت اور اس کی بعض ذیلی شاخوں کے اس مختصر بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تجربیت نے نہ صرف مذہب اور وحی کی برتری کو رد کیا بلکہ ادراک حقائق کا انحصار محض انسانی مشاہدے اور حسی تجربے کو قرار دے کر اسے ایک متبادل مذہب اور نظریۂ حیات بنا کر پیش کیا۔ اس نقطۂ نظر کو دوسرے علوم وفنون پر بھی غالب کر دیا اور انہیں لادینی بلکہ دین دشمنی کے رنگ میں رنگ دیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ مغربی فکر وتہذیب میں حسّی علم اور تجربے سے حاصل ہونے والا علم ہی یقینی اور حتمی ہوتا ہے اور خدا، وحی، فرشتے اور آخرت کا تصور چونکہ اس معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا وہ قابل ردّ ہیں اور مغربی فلسفۂ علم کی رو سے وہ علم کے معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا وہ توہمات (Superstitions) ہیں یا آسمانی تحکم پر مبنی Dogma ہیں، وہ علم بہر حال نہیں ہوسکتے کیونکہ حسّی اور تجربی علم کی رو سے وہ قابل تصدیق (Verifiable) نہیں ہیں۔ مغرب کا یہ نظریہ ممکن ہے سائنس میں ترقی کا ذریعہ اور سبب بنا ہو لیکن اس نے مذہب کو بہر حال دیس نکالا دے دیا ہے اور مغربی فکر وتہذیب کے ماننے والے اہلِ دانش، فلسفیوں اور سائنس دانوں کے ہاں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو (World View)

مغربی فکر وتہذیب کے بنیادی نظریات کے مطالعہ کے بعد اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ یہ جان سکیں کہ ان نظریات پر مبنی فکر سے کیسا ورلڈ ویو وجود میں آتا ہے۔ ورلڈ ویو مغرب کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر وتہذیب کی رو سے اہل مغرب کا تصورِ الٰہ، تصورِ انسان، تصورِ کائنات، اور تصورِ علم کیا ہے؟

تصورِ الٰہ

جیسا کہ ہم نے ہیومنزم کے بارے میں دیکھا کہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے اور بعد میں تحریک تنویر نے اُس وقت کے مذہب (عیسائیت) کو ردّ کر دیا کیونکہ وہ مذہب بادشاہت اور

جاگیرداروں کے ساتھ مل کر عوام کا استحصال کر رہا تھا۔ نیز حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات میں انحرافات اور یونان کے وقتی سائنسی نظریات کے اُس میں ادخال کے سبب جدید سائنسی اکتشافات کے خلاف ثابت ہو رہا تھا۔ لہٰذا ان دو وجوہ کی بنا پر اُبھرتی ہوئی مغربی تہذیب کے قائدین نے، اصلاً عیسائی ہونے کے باوجود، مذہب کو ردّ کر دیا اور عیسائیت کونوں کھدروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ جب مذہب ردّ ہوگیا تو تصورِ الٰہ یا تصورِ خدا جو مذہب کی جان ہے، منطقی طور پر وہ بھی ردّ ہوگیا۔ اور اگر ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ عیسائیت کا تصورِ الٰہ یعنی تثلیث ویسے بھی غیر فطری، غیر سائنسی، غیر عقلی اور مذہب کی حقیقی تعلیمات کے خلاف تھا، لہٰذا جدید مغربی تہذیب کا اُس کو ردّ کرنا قابل فہم محسوس ہوتا ہے۔

مغرب کے اس تصورِ خدا کا ملحدانہ اور کافرانہ ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے دلائل دینے کی بھی ضرورت نہیں اور ایک عام مسلمان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہیومنزم کفر صریح ہے اور ایک مسلمان ہرگز اس کو نہیں مان سکتا، خواہ اس کو ''انسانیت'' کا خوبصورت لبادہ پہنانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے!

تصورِ انسان

جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں دیکھا ہے کہ مغربی تہذیب کا تصورِ انسان جس کی ابتداء تحریک نشاۃ ثانیہ میں انسان کی تکریم اور اُسے کائنات میں مرکزی حیثیت دینے سے ہوئی تھی، اُس نے بالآخر مغربی تہذیب میں آسمانی خدا کے انکار اور خود انسان کے اپنا خدا خود ہونے کے تصور کو مستحکم کر دیا جیسا کہ ہم نے سارتر، ولیم جیمز اور نطشے وغیرہ کے اقوال میں دیکھا ہے۔ یوں مغربی تہذیب خدا مرکز (God-Centric) ہونے کی بجائے انسان مرکز (Human-Centric) بن گئی۔

ظاہر ہے یہ تصورِ انسان اسلام کے تصورِ انسان کے بالکل برعکس ہے کیونکہ اسلام میں انسان اللہ کا عبد ہے [1] اور اس کا کام ہر حالت میں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں بلاشروط و حدود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے۔

تصورِ کائنات

جب خدا کا تصور نہ رہا اور نہ رسولوں کا تو پھر آخرت کا تصور کہاں سے آتا؟ چونکہ میٹریل ازم

---

[1] وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝ [الذاریات ۵۱:۵۶]

یا مادہ پرستی میں یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی مادی زندگی ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح کیپٹل ازم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور یہی ہمارا ہدف اور مقصود ہے اور اس میں دولت اور آسائشوں اور راحتوں کا حصول ہی انسان کا مقصد زندگی ہے خواہ وہ جس قیمت پر بھی ہو۔

مغربی تہذیب آخرت کا انکار اس لحاظ سے بھی کرتی ہے کہ عقل اور حسی علوم کی بنیاد پر آخرت کا اثبات نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ظاہر ہے کہ آخرت نہ نظر آتی ہے اور نہ اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام آخرت پر مبنی دین ہے اور اس میں آخرت کو دنیا کی زندگی پر ہر حالت میں ترجیح حاصل ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے آخرت پر دنیا تو قربان کی جاسکتی ہے لیکن آخرت کو دنیا کے لیے برباد نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کو نبی کریم ﷺ نے یوں فرمایا ہے کہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''[۱] اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا کی اہمیت اللہ کی نظر میں ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ کافروں کو نہ دیتا۔[۲]

تصورِ علم

جیسا کہ ہم نے ایمپریسزم میں دیکھا کہ علم کا منبع یا تو عقل ہے یا حسی علم یعنی تجربہ اور مشاہدہ۔ اس کو مغربی دانشور یوں بھی کہتے ہیں کہ حتمی اور یقینی علم وہ ہے جو قابل تصدیق (Verifiable) ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے وحی اور منزل من اللہ ہدایت کی نفی اور رسولوں کی تعلیمات کا انکار۔

ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب کا یہ تصورِ علم اسلام کے تصورِ علم کے سو فیصد خلاف ہے کیونکہ اسلام میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا وہ حق ہے اور حرفِ آخر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ ﴿الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الملک ۶۷: ۲۶] اور ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَالْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ [البقرہ ۲: ۱۲۰]

---

[۱] اسے مستدرک حاکم اور مسند الفردوس میں حدیث کہا گیا ہے اگرچہ اکثر محدثین نے اسے ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔

[۲] جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۲۰

''کہہ دو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔اور (اے پیغمبر) اگر تم اپنے پاس علم (یعنی وحی خدا) کے آجانے پر بھی ان کی خواہشوں پر چلو گے تو تم کو (عذاب) خدا سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''

اسی طرح اللہ کا رسول اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پیغمبر جو بات کہے وہ بھی حق ہے اور حتمی طور پر سچی ہوتی ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم ۵۳: ۳، ۴]

''اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

اور یہ کہ ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر ۵۹: ۷]

''سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو۔اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔''

بلاشبہ اسلام میں عقل کا کردار بھی ہے جسے اجتہاد کی صورت میں دین نے ہمیشہ کے لیے شریعت میں اہم جگہ دی ہے لیکن یہ کردار ضمنی، جزوی اور نصوص کے ماتحت (Subordinate) ہے نہ کہ ان پر حاوی یا ان کے مساوی۔

اس وقت تک ہم نے مغربی تہذیب کے بنیادی افکار پیش کرنے کے بعد ان پر جو تبصرہ کیا ہے اُس سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب کے اساسی افکار خلافِ اسلام ہیں۔اسی طرح مغرب کا ورلڈ ویو اسلامی ورلڈ ویو کے بالکل برعکس ہے۔یہ بات اگرچہ سطورِ سابقہ سے واضح ہے لیکن ہم اسے مزید واضح کرنے کی خاطر ایک جدول کی صورت میں پیش کررہے ہیں تاکہ وہ ایک نظر میں قارئین کے سامنے آجائے اور مزید واضح ہوجائے:

مغربی تہذیب کے بنیادی نظریات	اسلام کے بنیادی نظریات
۱۔ ہیومنزم: خدا کا انکار، انسان کا خودمختار اور قادرِ مطلق ہونا۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا الْاِنْسَانَ کا شعار	خدا ہی اس کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ انسان اس کا عبد ہے۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا شعار

۲۔ سیکولرزم: خدا اور مذہب کو انسان کے اجتماعی معاملات (معاشرہ اور ریاست) میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ ہاں اگر فرد چاہے تو اپنی ذاتی اور پرائیویٹ زندگی میں خدا کو مان سکتا ہے۔	عبد کے لیے ضروری ہے کہ پورے کا پورا دین میں داخل ہو جائے۔ اسے اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی چلائے اور رب کی کچھ باتوں کو ماننے اور کچھ کو ماننے سے انکار کردے۔
۳۔ لبرل ازم: انسان چونکہ خود مختار ہے بلکہ مختارِ مطلق ہے لہٰذا اسے حق ہے کہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ وہ مادر پدر آزاد ہے۔ کوئی اس کی آزادی کو محدود نہیں کرسکتا۔	انسان خود مختار نہیں اللہ کا عبد ہے لہٰذا اللہ کے مقابلے میں وہ اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔ وہ مادر پدر آزاد نہیں بلکہ اس کی لگام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جتنی آزادی اسے دیتا ہے وہ لمبی رسی سے بندھے گھوڑے کی طرح اتنا ہی آزاد ہے۔ جہاں اس کی لمبائی ختم ہوئی اس کی آزادی بھی ختم ہوگئی۔
کیپٹل ازم/میٹریل ازم انسان مادہ پرست ہے، وہ دنیا پرست اور مال پرست ہے۔ دنیا کی زندگی ہی اس کے لیے سب کچھ ہے یہاں کی عیش، سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی انسان کا آخری ہدف ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے؟ لہٰذا راتوں رات امیر بننا چاہئے، مال کمانے اور خرچ کرنے میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کمانے، دنیا میں آگے بڑھنے معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہر آدمی میں ہونا چاہیے۔	اسلام ایک آخرت مرکز (Akhirat Oriented) دین ہے جس میں عبادت اور اخلاقی بلندی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ دار الامتحان ہے۔ یہاں کامیابی اس امر میں ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاری جائے اور اس کے نتیجے میں اخروی زندگی میں اللہ کی رضا اور جنت کی توقع رکھی جائے۔ اسلام میں غناء، مال و دولت کی کثرت میں نہیں توکل اور قناعت میں ہے۔

۵۔ایمپریسزم مغربی تہذیب کا فلسفۂ علم یہ ہے کہ حق کا منبع عقل اور حسی علم (انسانی تجربہ و مشاہدہ) ہے۔اور مذہبی روایات محض توہمات ہیں کیونکہ وہ قابلِ تصدیق (verifibale) نہیں ہیں اور اللہ، فرشتے نظر نہیں آتے لہٰذا آسمانی وحی سے نازل ہونے والا علم، علم ہی نہیں ہے، یہ محض غیر مصدقہ معلومات کا پلندہ ہے جو عقیدے کے تحکم (dogma) پر مبنی ہے نہ کہ علم حقیقی پر۔	علم کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ وہی علم کا خالق ہے اور انسان و کائنات کا بھی۔ اور مخلوق کو خالق سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا علمِ ہدایت فرشتے کے ذریعے پیغمبر کو بھجواتا ہے اور پیغمبر اس کی تشریح و تفسیر کرتا اور اس پر عمل کرکے دکھاتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں علم کا منبع ہے وحی یا قرآن و سنت۔ عقل کا بھی اس میں کردار ہے لیکن ذیلی اور ماتحت یعنی عقل اور حواس سے حاصل ہونے والا علم بھی صحیح ہے اگر وہ وحی کے مطابق ہو اور اس کے خلاف نہ ہو۔
مغرب کا ورلڈ ویو	**اسلام کا ورلڈ ویو**
۱۔تصور الٰہ کوئی خدا، کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں ہے جسے انسان پر غلبہ و قدرت حاصل ہو اور جس کی عبادت و اطاعت انسان پر فرض ہو۔	**۱۔تصور الٰہ** ایک اللہ تعالیٰ انسان، کائنات اور ساری مخلوق کا خالق، مالک رازق اور ہادی ہے۔وہ اس کے نفع و نقصان، غم اور خوشی اور زندگی و موت پر قادر ہے۔وہی معبود اور مطاع ہے۔
مغرب کا ورلڈ ویو	**اسلام کا ورلڈ ویو**
۲۔تصور انسان انسان اپنا خدا خود ہے۔ وہ خود مختار اور مختارِ مطلق ہے، وہ اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔وہ کسی الٰہ کا عبد اور مطیع نہیں ہے جس کے احکام کو ماننا اس کے لیے ضروری ہو۔	**۲۔تصور انسان** انسان اللہ تعالیٰ کا عبد ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہی زیبا ہے۔ اور وہ اللہ کا خلیفہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں تصرف کا اور حق کے رد و قبول کا جو اختیار دیا ہے، انسان اس کا استعمال اللہ کی مرضی کے مطابق کرتا ہے نہ کہ اس کے احکام کی مخالفت کرکے۔

۳۔تصور کائنات	۳۔تصور کائنات
زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔لہٰذا اس دنیا کی کامیابی اور اس میں سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی انسان کا مقصد زندگی اور ہدفِ زندگی ہونا چاہیے۔جہاں تک اس زندگی کے بعد کسی اور آنے والی زندگی کا تعلق ہے تو عقل اور سائنس سے اس کا ثبوت نہیں ملتا لہٰذا مغربی تہذیب اس سے اعتناء نہیں کرتی۔	موجودہ زندگی عارضی ہے۔ یہ دار الامتحان ہے۔انسان کا امتحان اس میں ہے کہ وہ زندگی یہاں اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق گزارے تاکہ آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہو۔ آخرت کی زندگی چونکہ دائمی ہے اور نتیجہ کی جگہ ہے لہٰذا آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب کے بنیادی افکار اور ان دونوں کے ورلڈ ویو کے تقابلی مطالعے سے بالکل شیشے کی طرح عیاں ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں اور ان کے بنیادی افکار نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں، ایک دوسرے کے برعکس ہیں، ان میں کوئی تقارب نہیں بلکہ ان میں بُعد ہے، دوری ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ بُعد المشرقین ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے متوازی طرزِ حیات ہیں جن کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی تہذیب کے اساسی افکار اور اس کا ورلڈ ویو کفر والحاد پر مبنی ہے۔اور جب یہ نظریات کفر والحاد پر مبنی ہیں تو منطقی طور پر اس کے ماننے والے ملحد اور کافر ہیں اور شرعی لحاظ سے مغربی تہذیب کو کفر اور اس میں یقین رکھنے والوں کو کافر سمجھنا اور کہنا اور اُن سے کفار جیسا سلوک کرنا ایک شرعی تقاضا ہے۔

یہ بات اگرچہ بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے کہ غیر مانوس محسوس ہو اس لیے ہم اسے قرآن وسنت کے مزید دلائل سے واضح کریں گے۔ (جاری ہے)

CPL No. 296 November 2021

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

پاکستان میں یوں تو بہت سی یونیورسٹیاں ہیں لیکن شاید ہی ان میں سے کوئی ایسی ہو جو اسلامی مقاصد کو پورا کرنے والی ہو، دینی تناظر میں کام کرتی ہو اور ایسی مسلم شخصیت کی تعمیر کرتی ہو جو عصر حاضر میں اسلام کا بہترین نمونہ ہو۔

ڈاکٹر محمد امین نے اس کتابچے میں یہ دکھایا ہے کہ اگر کوئی مطلوبہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہے تو اُس کی نوعیت، شکل اور منہج کیا ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم پر غور کرنے والوں کے لیے ایک فکر انگیز تصنیف۔

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان لاہور

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com